یکم مارچ ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۵

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمد الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱_۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

مغرب۔ اسرائیل کا دُہرا معیار: فلسطینی بچّوں کی نسل کُشی

Yara Hawari

۷ فروری ۲۰۲۵ء کو ۱۰ سالہ صدام رجب مقبوضہ مغربی کنارے کے ایک اسپتال میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گیا۔ وہ چند روز قبل ایک اسرائیلی فوجی کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ صدام اپنے گھر کے سامنے گلی میں کھڑا تھا جب اسرائیلی فوجیوں نے طولکرم کے قریب اس کے گاؤں پر حملہ کیا اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔

سی سی ٹی وی فوٹیج میں صدام کو گولی لگنے کا لمحہ لمحہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ گولی لگتے ہی وہ زمین پر گر گیا اور پیٹ کو تھام کر تکلیف کے باعث سمٹ کر بیٹھ گیا۔ جس اسپتال میں اسے ابتدائی طور پر لے جایا گیا تھا، وہ اس کا علاج کرنے سے قاصر تھا جس کے باعث اسے نابلس کے ایک دوسرے اسپتال منتقل کرنا پڑا۔

راستے میں ایمبولینس کو اسرائیلی فوجی چیک پوسٹ پر گھنٹوں تک روکے رکھا گیا جہاں ایک اسرائیلی فوجی نے صدام کے والد کو طعنہ دیتے ہوئے کہا کہ 'میں نے تمہارے بیٹے کو گولی ماری ہے، خدا کرے کہ وہ مر جائے'۔

صدام ان ۱۳۱ فلسطینی بچوں میں شامل ہے جنہیں اسرائیلی فوج نے رواں سال کے آغاز سے مقبوضہ مغربی کنارے میں شہید کیا۔ اسرائیلی فوجیوں اور آبادکاروں کے ہاتھوں مقبوضہ مغربی کنارے میں قتل ہونے والے فلسطینی بچوں کی تعداد جنوری ۲۰۲۳ء سے اب تک ۲۲۰ سے تجاوز کر چکی ہے جو ایک المناک حقیقت ہے۔

صدام کی کہانی دیگر فلسطینی بچوں کی طرح بین الاقوامی سرخیوں میں کبھی جگہ نہ بنا سکی۔ اس کے قتل پر عالمی برادری کی جانب سے کوئی ردعمل بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فلسطینی بچوں کے ساتھ مسلسل غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے اور ان کی تکالیف کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ان چند کہانیوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو میڈیا کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں، جیسا کہ ۵ سالہ ہند رجب کا واقعہ جسے اسرائیلی فوج نے ۲۹ جنوری ۲۰۲۴ء کو غزہ میں شہید کر دیا تھا۔ تقریباً ٹھیک ایک سال بعد اسی طرح صدام کو گولی ماری گئی۔

ہند اپنی خالہ، چچا اور کزنز کے ہمراہ غزہ شہر سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسرائیلی افواج نے ان کی گاڑی کو گھیرے میں لے لیا اور ان پر فائرنگ کر دی۔

ہند کے رشتہ دار جائے وقوع پر ہی جاں بحق ہو گئے لیکن وہ ابتدائی حملے میں زندہ بچ گئی اور فلسطین ریڈ کریسنٹ سوسائٹی سے مدد کے لیے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی فون کالز کی ریکارڈنگ جس میں وہ اسرائیلی ٹینکوں کے قریب آنے پر مدد کی درخواست کر رہی تھی، دنیا بھر میں صدمے اور غم و غصے کا باعث بنی۔

جو ایمبولینس اسے بچانے کے لیے بھیجی گئی تھی، وہ بھی واپس نہ آئی اور کچھ وقت بعد ہند کی ہلال احمر سے رابطے کی کوششیں بھی بند ہو گئیں۔ تقریباً دو ہفتے بعد ہند، اس کے رشتہ داروں، اور دو ایمبولینس کے کارکنان یوسف زینو اور احمد المدہون کی لاشیں برآمد ہوئیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اسرائیلی فوج نے جان بوجھ کر ایمبولینس اور ہند کی گاڑی پر فائرنگ کی حالانکہ انہیں ایمبولینسوں کی موجودگی کے درست محل وقوع (Coordinates) فراہم کیے جا چکے تھے۔

ہند کے المناک قتل کی خبر غیر معمولی طور پر بین الاقوامی میڈیا میں جگہ بنا سکی جبکہ غزہ میں ہلاک ہونے والے ۱۷ ہزار سے زائد بچوں میں سے بیشتر کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔

ہند کی شہادت کے واقعے کی حیثیت کو بھی کم کرنے اور اسے بطور معصوم بچی پیش کرنے سے گریز کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مثال کے طور پر جب کولمبیا یونیورسٹی کے طلبہ نے ایک عمارت کو ہند کے نام سے منسوب کیا، تو سی این این نے رپورٹنگ کرتے ہوئے وضاحت کی کہ ''ہند ہال'' ایک ''خاتون'' کے نام پر رکھا گیا ہے جو غزہ میں ماردی گئی تھی، گویا وہ ایک بچی نہیں بلکہ ایک بالغ عورت تھی۔

جنوری ۲۰۲۴ء کی اسکائی نیوز کی رپورٹ کے مطابق ایک براڈکاسٹر نے دعویٰ کیا کہ 'حادثاتی طور پر ایک گولی اگلی گاڑی میں جا پہنچی، جس کے نتیجے میں تین یا چار سالہ ایک نوجوان خاتون ہلاک ہو گئی'۔ یہ 'نوجوان خاتون' ایک فلسطینی

اندرونی صفحات پر

- بھارتی باشندے کینیڈا کا فوڈ بینک کھا گئے
- دنیا گرمی بحران کی زد میں
- اگر استنبول کا پانی ختم ہو جائے؟
- تجارت میں دھونس کا زمانہ گیا
- جمہوریت کی بقا کا سوال
- کیا ٹرمپ واقعی بااختیار ہیں؟
- مالدیپ توازن کی جانب گامزن؟
- بچے ہوم ورک سے نہیں سیکھتے!
- ڈیپ سیک نے اونچی دیواروں میں دراڑ ڈال دی

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

بچی رقیہ احمد عودہ جہالین تھی جسے اسرائیلی فوجیوں نے مغربی کنارے میں اپنے خاندان کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے پیچھے سے گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔

یہ مثالیں فلسطینی اسکالر نادرہ شلبو۔کیوورکیان کی طرف سے بیان کردہ 'ان چائلڈنگ' کے تصور کو واضح کرتی ہیں۔انہوں نے اس اصطلاح کو اس لیے وضع کیا تا کہ بچوں کے خلاف تشدد کے دوران ہونے والے غیر انسانی سلوک کو بے نقاب کیا جا سکے۔مقبوضہ اور نوآبادیاتی فلسطین میں فلسطینی بچوں سے ان کا بچپن چھین لیا جاتا ہے تا کہ ان پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کا جواز فراہم کیا جا سکے۔

دہائیوں سے اسرائیلی حکومت اور مغرب نے فلسطینی بچوں کو یا تو دوسرے بچوں سے کمتر ہونے کے طور پر پیش کیا یا پھر انہیں بچہ سمجھا ہی نہیں گیا۔انہیں اکثر بالغوں کے مساوی قرار دیا جاتا ہے جو 'دہشت گرد' بن سکتے ہیں۔اس طریقے سے انہیں فطری طور پر خطرناک سمجھا جاتا ہے اور ان سے 'بچے' کی حیثیت اور اس حیثیت سے جڑی معصومیت کو چھین لیا جاتا ہے۔

'ان چائلڈنگ' نہ صرف فلسطینی بچوں کے قتل اور معذوری کو چھپاتی ہے بلکہ یہ ان کے اغوا، حراست اور اسرائیلی جیلوں میں تشدد کے عمل میں بھی سہولت کاری کرتی ہے۔

پچھلے سال ایہم السلامہ جو سلوان، یروشلم کا ۱۴ سالہ فلسطینی لڑکا تھا، اسرائیلی جیل میں قید کی سزا پانے والا سب سے کم عمر فلسطینی بن گیا۔ایہم کو دو سال قبل گرفتار کیا گیا تھا اور اس پر غیر قانونی اسرائیلی آبادکاروں پر پتھر پھینکنے کا الزام عائد کیا گیا تھا۔

اس سے تفتیش کی گئی اور اسے دو سال تک گھریلو قید میں رکھا گیا، اس کے بعد اسے نئے اسرائیلی قانون کے تحت سزا دی گئی، وہ قانون جو فلسطینی بچوں کو 'دہشت گردی' کے زمرے میں آنے والے سنگین جرائم کے لیے قید کرنے کی اجازت دیتا ہے۔اسرائیل دنیا کا واحد ملک ہے جو بچوں پر منظم طور پر مقدمہ چلاتا اور انہیں قید کرتا ہے۔

اسرائیلی میڈیا باقاعدگی سے ایہم جیسے فلسطینی بچوں کو ممکنہ سکیورٹی خطرات، ذہنی طور پر تربیت یافتہ نابالغ یا انسانی ڈھال کے طور پر پیش کرتا ہے، تا کہ ان کی قید اور تشدد کو جواز فراہم کیا جا سکے۔

جیسے جیسے فلسطین میں نسل کشی بڑھتی جا رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ مزید فلسطینی بچے اور بزرگ اسرائیلی فوج کے ہاتھوں شہید ہوں گے اور دنیا خاموش تماشائی بن کر دیکھے گی۔ان کے قتل کو مغربی مین اسٹریم میڈیا میں نشر نہیں کیا جائے گا، ان کے خاندانوں کے انٹرویوز کے دوران بچپن کی تصاویر کی کوئی نمائش نہیں کی جائے گی اور نہ ہی عالمی رہنماؤں کی طرف سے کوئی مذمتی بیان آئے گا۔فلسطینی بچوں کو ان کے بچپن اور اس کے ساتھ ان کی انسانیت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ (مترجم: محمود الحق صدیقی)

"Unchilding Palestine's children".
("aljazeera.com". February 17, 2025)

بھارتی باشندے کینیڈا کا فوڈ بینک کھا گئے

Priyanjali Narayan

مغربی کلچر میں بہبودِ عامہ ایک بنیادی حقیقت ہے۔ براعظم امریکا اور یورپ، دونوں ہی خطوں میں اعلیٰ درجے کے فلاحی اور خیراتی ادارے پائے جاتے ہیں۔ان اداروں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جو لوگ زیادہ کمانے کے قابل نہیں، وہ اپنی ضرورت کی ہر چیز حاصل کریں اور قدرے بہتر انداز سے جئیں۔یہ ادارے کھانا بھی فراہم کرتے ہیں۔

کینیڈا میں غریبوں کو مفت کھانا فراہم کرنے کے لیے ۵۵۰۰ سے زائد فوڈ بینک ہیں۔لوگ فوڈ بینک سے کھانے پینے کی اشیا مفت حاصل کرتے ہیں۔اب یہ فوڈ بینک بحرانی کیفیت سے دوچار ہیں کیونکہ اِن سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

کینیڈا میں رہائش بھی مہنگی ہے اور تعلیم بھی۔سفر کے لیے بھی اچھا خاصا خرچ کرنا پڑتا ہے۔یہی سبب ہے کہ نئے تارکینِ وطن کو کینیڈا کے شہروں میں رہنے کے لیے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایسے میں کھانے پینے کے جھنجھٹ سے نجات کے لیے یہ لوگ فوڈ بینک کا رخ کرتے ہیں۔خیراتی کھانا لینے والوں کی تعداد اب اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ فوڈ بینک بحران سے دوچار ہوگئے ہیں۔فوڈ بینک کا رخ کرنے والوں میں ۳۰ فیصد وہ ہیں جو نئے نئے کینیڈا آئے ہیں۔ایسے میں فوڈ بینک کینیڈین ڈریم کے لیے ریلیٹی چیک کی طرح ہیں۔

جوزیفائن سِنڈانی اُس وقت آٹھ برس کی تھی جب وہ پہلی بار فوڈ بینک گئی تھی۔جوزیفائن اور اُس کی ماں افریقی ملک سوڈان سے کینیڈا منتقل ہوئی تھیں۔دارالحکومت اوٹاوا کی ہڈیوں میں گودا جما دینے والی سردی کا مقابلہ کرنا اُن کے لیے بہت مشکل مرحلہ تھا کیونکہ سوڈان بہت گرم ملک تھا جہاں سردی برائے نام پڑتی ہے۔اُس دن جوزیفائن نے اپنی ماں کو کھلونوں، جیکٹ اور کرسمس کے تحائف کے ساتھ گھر آتے دیکھا۔جوزیفائن اور اُس کی ماں نے فوڈ بینک کے ذریعے خوراک کا مسئلہ حل کیا۔تعلیم پانے کے بعد اب جوزیفائن کنسٹرکشن بزنس میں ہے۔

دوسروں کے لیے سہارا بننے والے فوڈ بینک اب خود بحرانی کیفیت کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔یہ بحران کینیڈا کی ایک مایوس کن حقیقت ہے۔کینیڈا بہت سے بھارتی باشندوں کے لیے اب خوابوں کی منزل میں تبدیل ہو چکا ہے۔

صرف ایک ماہ میں ۲۰ لاکھ سے زائد افراد فوڈ بینک سے مستفید ہوئے ہیں۔فوڈ بینکس کینیڈا ہنگر کاؤنٹ ۲۰۲۴ء کی رپورٹ کے مطابق یہ تعداد ۲۰۲۳ء کے مقابلے میں ۶ فیصد اور ۲۰۱۹ء کے مقابلے میں ۹۰ فیصد زیادہ ہے۔رہائشی کرائے بڑھتے جا رہے ہیں اور مہنگائی کی شرح بھی بڑھتے رہنے پر تُلی ہوئی ہے۔ایسے میں کم آمدنی والے افراد کے پاس فوڈ بینک سے مدد لینے کے سوا چارہ نہیں۔

فوڈ بینک سے مستفید ہونے والوں میں ۳۰ فیصد وہ ہیں جو نئے نئے آئے ہیں۔۳۲ فیصد سے زائد وہ ہیں جو کینیڈا میں ۱۰ سال یا اِس سے کم مدت سے مقیم ہیں۔فوڈ بینک سے مستفید ہونے والوں میں اکثریت بھارتی باشندوں کی ہے۔

نیشنل فاؤنڈیشن فار امریکن پالیسی کے مطابق ایک عشرے کے دوران بھارت سے کینیڈا امیگریشن میں ۳۲۶ فیصد اضافہ ہوا ہے۔اس دوران کینیڈین تعلیمی اداروں میں بھارتی طلبہ کی انرولمنٹ ۵۸۰۰ فیصد بڑھی ہے۔یہ طلبہ پرائیویٹ کالجوں میں انرولمنٹ کراتے ہیں اور اِن میں سے چند ہی ہیں جو باقاعدگی سے کالج جاتے ہیں۔کینیڈا ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔بس یہی کافی ہے۔یہ طلبہ ایک ترقی یافتہ ملک میں رہتے ہوئے مستقبل کو تابناک بنانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔

کینیڈا میں تارکینِ وطن کی تعداد کے بڑھتے رہنے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہاں آنے اور مستقل قیام کا اجازت نامہ حاصل کرنے کا عمل بہت آسان اور سستا ہے۔زیادہ قانونی پیچیدگیاں نہیں پائی جاتیں۔

کینیڈا پہنچنے اور مستقل بنیاد پر آباد ہونے کی کوشش کرنے والوں کی تعداد ایک عشرے میں کئی سو فیصد بڑھی ہے مگر

ہاؤسنگ اور ہیلتھ کیئر کا انفرا اسٹرکچر وہی کا وہی ہے۔ ایک طرف حکومت رہائشی یونٹس کی تعداد بڑھانے میں ناکام رہی ہے اور دوسری طرف ملازمت کے نئے مواقع پیدا کرنا بھی ممکن نہیں ہوسکا ہے۔ مہنگائی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ کچن آئٹم خریدنا بھی دشوار ہوتا جارہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ فوڈ بینکس پر دباؤ بڑھتا جارہا ہے۔ لوگ سوچتے ہیں کھانے پینے کا خرچہ تو بچا ہی لیا جائے۔

کینیڈا میں فوڈ بینک ایک زمانے سے نادار اور پریشان حال افراد کی مدد کرتے آئے ہیں مگر اب بحرانی کیفیت اس قدر ہے کہ وینکوور کے ایک فوڈ بینک نے ان بیرونی طلبہ کو کھانے پینے کے آئٹم دینے سے انکار کا فیصلہ کیا ہے جو کالج میں پہلے سال میں ہیں۔

دی گریٹر وینکوور فوڈ بینک کا کہنا ہے کہ بیرونی طلبہ کے لیے کینیڈا کی پالیسی سفراور ٹیشن کی مد میں ۲۰ ہزار ۶۳۵ ڈالر اضافی طور پر ادا کرنے کا پابند بناتی ہے۔ اتنی زیادہ ادائیگی کرنے کے بعد ان کے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔

کینیڈا میں دنیا بھر سے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ طلبہ بھی دنیا بھر کے ہیں مگر سب سے زیادہ طلبہ بھارت سے ہیں۔ بعض تعلیمی اداروں میں بھارتی طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ دیکھنے والوں کو لگتا ہے دہلی یا ممبئی کے کسی کالج میں قدم رکھ دیا ہے۔

اپریل میں ایک بھارتی طالب علم نے سوشل میڈیا پر اپنی وڈیو اپ لوڈ کی تھی جس میں اس نے خاصی بے شرمی اور ڈھٹائی سے اُن چیزوں کی نمائش کی تھی جو اس نے فوڈ بینک سے بٹوری تھیں۔ یہ سب کچھ اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس نے تسلیم کیا تھا کہ اس نے فوڈ بینک سے ہزاروں ڈالر کی چیزیں حاصل کی ہیں۔ اس نے اب تک بچائی ہوئی رقم کا حساب بھی پیش کیا تھا۔ اس وڈیو کے وائرل ہوتے ہی ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ لوگوں نے اس نوجوان پر شدید نکتہ چینی کی تھی اور پھر اُس کے ادارے نے اُس کی ملازمت بھی ختم کردی تھی۔ وہ اچھی خاصی تنخواہ پاتا تھا مگر پھر بھی خیرات کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا۔

کینیڈا میں کم آمدنی والے افراد کے لیے فوڈ بینک بہت بڑا سہارا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ شدید عسرت کے زمانے میں فوڈ بینک کا سہارا لیتے ہیں اور جب اچھی جاب مل جاتی ہے تو اپنے بل پر کھانے پینے کا اہتمام کرتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کا گزارا جب تنخواہ سے نہیں ہو پاتا تو وہ بنیادی سہارے کے طور پر فوڈ بینک کا رخ کرتے ہیں۔ فوڈ بینک والی اپنی گاڑی کہیں بھی کھڑی کردیتے ہیں اور جو بھی چاہے، وہاں سے کھانے پینے کی چیزیں لے سکتا ہے۔ اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ جن کے مالیاتی وسائل اچھے ہیں، وہ فوڈ بینک سے مدد نہ لیں۔

جوزیفائن سِنڈانی کہتی ہے کہ فوڈ بینک سے مدد لینے میں ہرج نہیں مگر کسی جواز کے بغیر مدد لینے سے عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے۔ ضرورت مند ہو کر بھی کوئی کچھ لیتا ہے تو عزتِ نفس بہرحال مجروح ہوتی ہے۔ انسان اپنی ہی نظروں میں گرنے لگتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غیرت مند افراد صرف ضرورت کی حد تک خیراتی اداروں سے مستفید ہوتے ہیں۔

کورونا وائرس کی وبا کے دوران بھی فوڈ بینک نے لاکھوں کینیڈینز کی مدد کی۔ آج بھی ہر سال کینیڈا کے لاکھوں باشندے فوڈ بینک کے ذریعے اپنا گھر ڈھنگ سے چلاتے ہیں۔ کینیڈا کے طول و عرض میں ۵۵۰۰ فوڈ بینک پریشان حال لوگوں کی مدد کر رہے ہیں۔ اشیائے خورونوش کی بڑھتی ہوئی قیمتوں نے عام کینڈین باشندے کے لیے جینا دشوار کردیا ہے۔ بڑے شہروں میں رہائش اس قدر مہنگی ہے کہ لاکھوں کینیڈین باشندے بھی اُن میں آباد ہونے کا خواب تک نہیں دیکھتے۔ دی کنزرویشن کی رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۰ء اور ۲۰۲۱ء کے دوران کینیڈا میں املاک کی قیمت میں ۳۵۵ فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔

رہی سہی کسر بے روزگاری نے پوری کردی ہے۔ مہنگائی پر قابو پانے میں کسی حد تک مدد ملی ہے مگر بے روزگاری اور بلند رہائشی کرائے معاملات کو خراب کر رہے ہیں۔ بینک آف کینیڈا کا کہنا ہے کہ عوام کو گروسریز کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں مل رہی۔ حکومت راحت دینے میں ناکام رہی ہے۔

کانفرنس بورڈ آف کینیڈا کے چیف اکنامسٹ پیڈرو اینٹیونز نے ریڈیو کینیڈا سے ایک انٹرویو میں کہا کہ کینیڈین معیشت کی نمو اس لیے رک گئی ہے کہ تمام حصے یکساں رفتار سے فروغ نہیں پا رہے۔ اس وقت کینیڈا میں مہنگائی قابو میں ہے تاہم معیشتی نمو یقینی بنانے کے لیے اجرتوں میں اضافہ ناگزیر ہے۔ تب تک لوگ فوڈ بینک پر انحصار پذیر رہیں گے۔ تارکینِ وطن کی بڑی تعداد چونکہ فوڈ بینک پر منحصر ہے، اس لیے ملکی باشندوں کو خاطر خواہ حد تک مدد نہیں مل پا رہی۔ فوڈ بینک پر بڑھتا ہوا انحصار معاملات کو خرابی کی طرف لے جارہا ہے۔ فوڈ بینک کینیڈا کے چیف ایگزیکٹیو افسر کرسٹن ہیَرڈزلے کہتے ہیں کہ بحران جڑ پکڑتا جارہا ہے۔ ایسے میں لازم ہے کہ حکومت آگے بڑھے اور ہماری مدد کرے۔ رواں سال فوڈ بینک سے مستفید ہونے والوں کی تعداد میں ۳۰ فیصد اضافہ متوقع ہے۔ مقامی یعنی سفید فام کینیڈینز کے لیے فوڈ بینک سے مستفید ہونا دشوار تر ہوتا جارہا ہے۔

فوڈ بینک کی ایگزیکٹیو لیزلے برجیس نے سی بی سی کو بتایا کہ مسائل پیچیدہ تر ہوتے جارہے ہیں۔ ایسے میں لازم ہے کہ فوڈ بینک کو مضبوط بنانے پر توجہ دی جائے اور رولز بھی تبدیل کیے جائیں۔ لیزلے برجس کا کہنا ہے کہ فوڈ بینک بھوک پر قابو پانے میں آج مدد کرسکتا ہے مگر کل شاید ایسا کرنا ممکن نہ ہو۔ حکومت کو آگے بڑھ کر کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ایک طرف تو اشیائے خورونوش کی قیمتیں نیچے لانی ہیں اور دوسری طرف اجرتوں کا گراف بلند کرنا ہے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Crisis at Canada food banks is a reality check of the Canadian dream".
("India Today". October 31, 2024)

●●●

بقیہ: ڈیپ سیک نے اونچی دیواروں میں دراڑ ڈال دی

زندگی کو آسان تر بنانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرے گی۔ سوچ وہ ہونی چاہیے جس میں سب کا فائدہ ہو۔ مسابقت کے نام پر ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کی ضرورت نہیں۔

ٹیکنالوجی سے متعلق امور کے ماہر ایلون گرپلن کہتے ہیں کہ ڈیپ سیک کی کامیابی نے اے آئی میں امریکا کی سُکڑتی ہوئی برتری طشت از بام کردی ہے۔ اس حوالے سے ہتھیاروں کی دوڑ جیسا ماحول پیدا کرنے کے بجائے مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

جدید ٹیکنالوجی کے حوالے سے ذمہ دارانہ طرزِ فکر و عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا اُسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی ذہنیت پر عمل پیرا ہونے کے بجائے اشتراکِ عمل کی ذہنیت کو اپنایا جائے، ایک دوسرے کو قبول کرکے آگے بڑھنے پر دھیان دیا جائے۔ ٹیکنالوجی مسائل بھی پیدا کر رہی ہیں۔ اِن کے حل کے لیے مل کر کام کرنا ہی بہتر ہے۔ کوئی ایک ملک چند ایک معاملات میں برتری لے سکتا ہے مگر تمام ہی معاملات میں اُس کی برتری قائم ہو اور برقرار رہے، ایسا ممکن نہیں۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"DeepSeek cracks the 'high walls and small courtyards'." ("cgtn.com". January 28, 2025)

●●●

دُنیا گرمی بُحران کی زَد میں

دنیا بھر میں درجۂ حرارت بڑھتا جارہا ہے۔اس کے بہت سے بنیادی اسباب ہیں۔ ایک طرف تو فضا میں کاربن ڈایوکسائڈ کی مقدار بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف وہ قدرتی سہولتیں ختم ہوتی جارہی ہیں جو ماحول کو متوازن رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اگر گاڑیوں کا دھواں فضا میں بڑھ بھی جائے تو جنگلات کا رقبہ بڑھانے کی صورت میں خرابی کا سامنا ڈھنگ سے کیا جاسکتا ہے۔ جنگلات کا رقبہ گھٹ رہا ہے کیونکہ لوگ ایک طرف تو لکڑی کے حصول کے لیے درخت کاٹ رہے ہیں اور دوسری طرف آبادیوں کو توسیع دینے کی کوشش میں حیوانات کے لیے جگہ کم پڑتی جارہی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ اس وقت ہماری زمین شدید بحرانی کیفیت سے دوچار ہے۔ سالِ رواں کے دوران ہر ماہ معلوم تاریخ کا گرم ترین مہینہ ثابت ہوا ہے۔ انسان نے سات آٹھ عشروں کے دوران ماحول کو نقصان پہنچانے والی (گرین ہاؤس ایفیکٹ) گیسوں کے اخراج پر قابو پانے کی برائے نام بھی کوشش نہیں کی۔ پسماندہ ممالک میں توانائی اور ایندھن کے ذریعے کے طور پر لکڑی اور قدرتی تیل جلایا جاتا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ماحول کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا، وہ پہنچ ہی چکا ہے۔

چار عشروں کے دوران عالمگیر سطح پر درجۂ حرارت مسلسل بڑھتا رہا ہے۔ گزشتہ عشرے کے دوران ہر برس معلوم تاریخ کا گرم ترین برس رہا ہے۔ خلائی تحقیق کے امریکی ادارے ناسا نے دنیا بھر میں واقع موسمی کیفیت پر نظر رکھنے والے اداروں سے حقائق اور اعداد و شمار لے کر اُن کے تجزیے کی بنیاد پر بتایا ہے کہ کرۂ ارض کا ماحول اس وقت خطرناک حد تک بحرانی کیفیت کا شکار ہے۔

جنوبی ایشیا میں گزشتہ ماہ اور رواں ماہ کے دوران کئی ملکوں میں ہیٹ ویوز آئیں۔ پاکستان، بھارت اور بنگلا دیش کے علاوہ سری لنکا اور افغانستان بھی شدید گرمی کی لہر سے دوچار ہیں۔ پاکستان میں چند روز کے دوران لوگوں کو گرمی سے تھوڑی سی راحت ملی ہے مگر وہ بھی صرف چند علاقوں میں۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے بیشتر علاقے اس وقت شدید گرمی کی لپیٹ میں ہیں۔

ناسا کے گوڈرڈ انسٹیٹیوٹ فار اسپیس اسٹڈیز سے وابستہ ماہرین نے بتایا کہ مئی ۲۰۲۴ء سے زیادہ گرم مئی کوئی نہیں گزرا۔ اور خیر سے ایک سال کے دوران دنیا بھر میں شدید گرمی ہی رہی ہے۔ یہ سب کچھ انتہائی خطرناک ہے کیونکہ دنیا بھر میں عام آدمی شدید متاثر ہو رہا ہے۔ ایک طرف تو بیماریاں پھیل رہی ہیں اور دوسری طرف کاروباری سرگرمیاں متاثر ہو رہی ہیں۔ بے قاعدہ بارشوں کے نتیجے میں سیلابی کیفیت سے بعض ممالک کے بیشتر علاقے مزید پسماندگی کی طرف چلے گئے ہیں۔

ناسا کے ایڈمنسٹریٹر بل نیلسن کہتے ہیں ''اب اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ ہم ماحول کے معاملے میں ایک بہت بڑے بحران کے سامنے کھڑے ہیں۔ اس وقت شمالی اور جنوبی امریکا بھی غیر معمولی گرمی کی زد میں ہیں۔ ایریزونا، کیلیفورنیا اور نیواڈا کی طرح دنیا بھر کے ممالک میں بیشتر علاقے غیر معمولی گرمی کا سامنا کر رہے ہیں۔ ماحول کو متوازن رکھنے لیے کی جانے والی کوششیں ضرورت سے بہت کم اور نیم دِلانہ ہیں۔ ناسا اور بائیڈن ہیرس ایڈمنسٹریشن اس بات کو بہت شدت سے محسوس کر رہی ہیں کہ زمین کو بچانے کے لیے عالمگیر عمومی ہنگامی حالت کا اعلان ناگزیر ہے۔ لازم ہو چکا ہے کہ دنیا بھر میں لوگوں کو ماحول کے شدید منفی اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوششوں میں اضافہ کیا جائے۔ یہ کام عالمگیر سطح ہی پر کیا جاسکتا ہے کیونکہ کسی ایک ملک یا چند ممالک کے گروہ میں ایسا کرنے کی صلاحیت و سکت نہیں پائی جاتی''۔

ترقی یافتہ ممالک نے چاہا ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں ماحول کو نقصان پہنچانے والی گیسوں کے اخراج پر قابو پایا جائے مگر ایسا ہو نہیں پا رہا کیونکہ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں کمزور طرزِ حکمرانی اجتماعی مفاد کے فیصلوں کی تعمیل کرانے میں ناکام رہی ہے۔ حالیہ بارہ ماہ کے دوران ریکارڈ درجۂ حرارت سے قبل ۲۰۱۵ء اور ۲۰۱۶ء کے دوران مسلسل ۷ ماہ تک دنیا بھر میں انتہائی گرمی پڑی تھی۔

ناسا کے چیف سائنٹسٹ اور سینئر کلائمیٹ ایڈوائزر کیلون کہتے ہیں کہ ''گرم ترین ترین دن، مہینے اور سال ہمارے حصے میں آرہے ہیں۔ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ شدید گرمی ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے یعنی ایک طرف تو گرین ہاؤس ایفیکٹ والی گیسوں کا اخراج کم نہیں کیا جاسکا ہے اور دوسری طرف درخت بہت بڑے پیمانے پر کاٹے جارہے ہیں۔ جنگلات کا گھٹتا ہوا رقبہ دنیا بھر میں بہت بڑے پیمانے پر خرابیاں پیدا کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور ہم صرف تماشا دیکھ رہے ہیں''۔

ناسا کی تحقیق اور ماہرانہ رائے کے مطابق کسی بھی خطے میں درجۂ حرارت کی بیس لائن بالعموم تین عشروں کے مجموعی درجۂ حرارت اور اس میں پیدا ہونے والے نشیب و فراز کی بنیاد پر طے ہوتی ہے۔ گزشتہ بارہ ماہ کے دوران اوسط عالمگیر درجۂ حرارت ۱٫۳ سینٹی گریڈ رہا ہے۔ یہ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۸۰ء کے دوران طے کی جانے والی عالمگیر بیس لائن سے زیادہ ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے مقابلے میں یہ ۱٫۵ سینٹی گریڈ زیادہ ہے۔

ناسا کے ماہرین دنیا میں موسمی کیفیت پر نظر رکھنے والے اداروں کے علاوہ جہازوں پر نصب آلات کی مدد سے بھی زمین کے مجموعی درجۂ حرارت کی پیمائش کرتے ہیں۔ خام معلومات کی مدد سے شہری علاقوں میں شدید گرمی کے منفی اثرات کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور پھر اُن معلومات کی بنیاد پر حکومتوں کو سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

ایل نینو اور لا نینا نامی قدرتی مظاہر بحرالکاہل کو گرم اور سرد رکھنے میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان مظاہر ہی سے عالمی درجۂ حرارت میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ ۲۰۲۳ء کے موسمِ بہار میں طاقتور ایل نینو ایفیکٹ پیدا ہوئی جس نے دنیا کو بھٹی بنا ڈالا۔

مئی ۲۰۲۴ء کی موسمی کیفیت اور متعلقہ اعداد و شمار کی روشنی میں موسمیات کے عالمی اداروں نے پیش گوئی کی ہے کہ جون اور اگست کے دوران لا نینا کی لہر کے پیدا ہونے کا امکان ۴۹ فیصد ہے جبکہ جولائی اور ستمبر کی درمیانی مدت کے دوران لا نینا ایفیکٹ عالمی درجۂ حرارت کو جزوی طور پر نیچے لاسکتا ہے۔ یہ بحرالکاہل کے ٹھنڈا پڑنے سے ہوگا۔

پاکستان اور بھارت میں گرمی کا موسم پورے جوبن پر ہے۔ بھارت میں کئی ہیٹ ویوز آچکی ہیں۔ متعدد ریاستیں گرمی کی لپیٹ میں ہیں۔ کروڑ انسانوں کے لیے دن کا وقت عذاب کی صورت ہے۔ بھارت سے سَٹے ہوئے پاکستانی علاقوں میں بھی گرمی کو زور نہیں ٹوٹ رہا۔ ویسے پاکستان میں پڑنے والی گرمی کچھ بھارت کے موسم پر منحصر نہیں۔ سندھ اور بلوچستان میں جسم کے ساتھ ساتھ روح تک کو جھلسانے والی گرمی پڑتی ہے۔

شدید گرمی سے دوچار ممالک کی حکومتوں پر لازم ہے کہ معاملے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے ایسے اقدامات کریں جن سے چند برسوں کے دوران گرمی کا زور ٹوٹے۔ ماحول میں ٹھنڈک پیدا کرنے کے لیے ایک طرف تو گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج روکنا ہوگا اور دوسری طرف شجر کاری کے رجحان کو زیادہ سے زیادہ تقویت بہم پہنچانی ہوگی تاکہ ماحول کو ٹھنڈا رکھنے والے عوامل پوری قوت کے ساتھ موجود ہوں۔

(ترجمہ: ابوصباحت)

"Earth in crisis mode: Every month in 2024 has been the hottest on record".
("India Today". June 13, 2024)

اگر استنبول کا پانی ختم ہو جائے؟

Katie Nadworny

استنبول دنیا کے بڑے شہروں میں سے ہے اور اِس کا حجم بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اِس کے پانی کے ذخائر پر غیر معمولی رفتار سے دباؤ بڑھا رہی ہے۔ جُو دی ہاربرٹ اکثر ایک خاص نسل کے شِکرے کے بارے میں اظہارِ خیال کرتی رہتی ہے۔ یہ شِکرا استنبول کے پانی کے بڑے ذخائر کے کناروں پر دکھائی دیا کرتا تھا۔ جس قصبے کی وہ رہنے والی ہے، وہ تو کب کا استنبول کی وسعتوں میں گم ہو چکا ہے۔ دریا کے کنارے وہ شِکرے اُترا کرتے تھے جو اَب جُو دی کی یادوں کا حصہ ہیں۔ اِس دریا میں حیاتیاتی تنوع تھا۔ طرح طرح کے پرندے اور کیڑے مکوڑے یہاں ہوا کرتے تھے۔ جب میونسپلٹی نے دریا کے ساتھ ساتھ کنکریٹ کی دیوار کی تعمیر شروع کی تو یہ شِکرے غائب ہو گئے۔ یہ کوئی اچھا شگون نہ تھا۔

جُو دی کا کہنا ہے کہ یہی وہ علاقہ تھا جہاں پانی ٹھہرا کرتا تھا۔ اگر شہر کو خشک سالی سے بچانا ہے تو دریا کے کنارے کی زمین کو پانی کی فراہمی جاری رہنی چاہیے۔ یہ علاقہ ہمیشہ نم رہنا چاہیے۔ اگر دریا کے کنارے کنارے کنکریٹ کی دیوار کھڑی کر دی جائے تو پھر پانی کے ذخیرے کو سلامت رکھنا ممکن ہی نہیں۔

ایک چھوٹے سے دریا کے حوالے سے پیدا ہونے والی پیچیدگی ایک بڑے مسئلے کا محض ایک جُز ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کبھی استنبول کے پانی کے ذخائر دم توڑ دیں تو کیا ہوگا۔

جنوری ۲۰۲۱ء میں استنبول کے شہریوں کو بُری صورتحال سے ڈرانے والی خبریں سُننے اور پڑھنے کو ملنے لگیں۔ یہ کہا جانے لگا کہ صرف ۴۵ دن میں استنبول کے آبی ذخائر ختم ہو جائیں گے۔ ایک طرف تو پانی کے ذخائر کی سطح خطرناک حد تک گر چکی تھی اور دوسری طرف بارشیں بھی نہیں ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بہت جلد ڈیڑھ کروڑ کی آبادی کا شہر پانی کی بوند بوند کو ترسے گا۔ ترکی کے ڈائریکٹوریٹ آف ریلیجس افیئرز (دیانت) کی ہدایات کے مطابق نماز جمعہ کے بعد استنبول کی مساجد میں بارش کے لیے دعائیں کی گئی۔

ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ۲۰۱۴ء میں استنبول کے آبی ذخائر کے خطرے میں ہونے کی خبریں نمودار ہوئی تھیں۔ تب استنبول کے علاقے کاد یکوئے میں چار دن تک برائے نام بھی پانی نہ تھا۔ استنبول جیسے بڑے شہر میں پانی کے بحران کا سر اٹھانا کسی بھی طور کوئی حیرت انگیز یا غیر متوقع امر نہیں۔ لوگ تھوڑے سے پریشان ہوتے ہیں اور پھر پانی کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ جب پانی کی بندش کا دورانیہ بڑھ جاتا ہے، تب لوگ پریشان ہو اٹھتے ہیں اور اُن کی بدحواسی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ ۲۰۱۴ء میں جب چار دن تک پانی نہیں ملا تو لوگ سڑکوں پر آ گئے اور مقامی حکومت سے مطالبہ کرنے لگے کہ جلد از جلد پانی دیا جائے۔

اب ایک بار پھر خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ ۴/اکتوبر ۲۰۲۴ء کی بات ہے۔ استنبول کے پانی کے ذخائر کی سطح ۳۷ فیصد رہ گئی تھی۔ دسمبر ۲۰۲۳ء میں ترکیہ کے وزیرِ زراعت و جنگلات ابراہیم یُما کی نے قوم کو بتایا کہ ترکیہ کو پانی کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ اگر معاملات درست نہ ہوئے اور بارشیں نہ ہوئیں تو ۲۰۳۰ء تک ترکیہ کے بیشتر علاقوں کے لوگوں کو پانی کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

استنبول کے پانی کا ایک اہم ذریعہ کوچکمیک نامی تالاب ہے۔ یہ بہت تیزی سے آلودہ ہوتا جا رہا ہے اور اِس کے خشک ہونے کا عمل بھی تیز ہو چکا ہے۔ خشک سالی اب دروازے ہی پر کھڑی ہے۔ وہ دن بہت نزدیک آ رہا ہے جب استنبول کے حصے کا پانی بالکل ختم ہو چکا ہوگا۔

آبی امور کے ماہر اور بوغازیشی یونیورسٹی کے استاد ایلگن اِلہان کا کہنا ہے کہ استنبول میں پانی کی قلت بڑھتی جا رہی ہے۔ ہم اُس مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں جہاں پانی کی قلت سے انسانوں ہی کو نہیں بلکہ پورے قدرتی ماحول کو غیر معمولی نقصان پہنچ چکا ہوگا۔ ہمیں زمینی حقیقت کا سامنا کرنا ہوگا۔ لازم ہو چکا ہے کہ ہم اصلاحِ احوال کے لیے کچھ کریں۔ اگر ہم نے استنبول میں پانی کی قلت دور کرنے کے حوالے سے کچھ نہ کیا تو بہت زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ استنبول پانی کا شہر ہے۔ اِس کے اطراف پانی ہی پانی ہے۔ شمال میں بحیرۂ اسود ہے۔ جنوب میں بحیرہ مرمرہ ہے اور آبنائے باسفورس شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ یہ سارا پانی نمکین ہے اور استنبول کو میٹھا پانی فراہم کرنے والا کوئی دریا نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ استنبول کی ملکی اور عالمی حیثیت میں اضافہ ہوا ہے۔ شہر پھیلا ہے، آبادی بڑھی ہے اور بہت سے نواحی علاقوں کو اب شہر کے مرکز نے ہڑپ کر لیا ہے۔ اِس کے نتیجے میں استنبول میں پانی کی طلب بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ استنبول میں پانی کی فراہمی کا جو بنیادی ڈھانچا قدیم دور میں قائم کیا گیا تھا وہ اب تک موجود ہے۔

استنبول ہمیشہ ایک اہم شہر تھا۔ اب یہ میگا سٹی ہے یعنی رقبہ بھی بہت زیادہ ہے اور آبادی بھی غیر معمولی ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں استنبول کی آبادی بہت تیزی سے بڑھی۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں استنبول کی آبادی دس گیارہ لاکھ تھی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک استنبول کی آبادی ۵۰ لاکھ ہو چکی تھی اور اب اس کی آبادی، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک کروڑ ۷۱ لاکھ ہو جائے گی۔ آبادی کے بڑھتے جانے سے پانی کی طلب بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ شہر میں ضرورت سے کہیں کم پانی ہے۔

استنبول کو پانی کی فراہمی کے معاملات کی نگرانی کرنے والے ادارے نے شہر میں پانی کی قلت پر قابو پانے کے لیے شہر سے سیکڑوں کلومیٹر دور سے پانی لانے کا اہتمام کیا ہے۔ بنیادی ڈھانچا اپ گریڈ کرتے ہوئے ڈیم کی تعمیر کو ترجیح دی گئی۔ معاملہ یہ ہے کہ جب مدتِ دراز تک بارشیں نہیں ہوتیں، تب یہ ذریعہ بھی سُوکھ جاتا ہے تو متعلقہ دیہات کی اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے پانی کم پڑ جاتا ہے۔ زراعت بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ بہت سے دیہی علاقوں کے باشندوں کو پانی کی اِتنی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ نقل مکانی پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ دیہات کے حصے کا پانی استنبول کو فراہم کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ اِس کے نتیجے میں استنبول میں پانی کا بحران مزید شدت اختیار کرتا ہے۔

دنیا بھر میں بڑے شہروں میں پانی کی کھپت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بڑے شہر ملک کے باقی حصوں اور بالخصوص دیہی علاقوں کے حصے کے پانی پر ڈاکا ڈالتے رہتے ہیں۔ استنبول کا بھی یہی معاملہ ہے۔ جُو دی ہاربرٹ کا کہنا ہے کہ استنبول کو پانی فراہم کرتے رہنے سے ترکیہ کے بہت سے علاقوں کو پانی کی فراہمی میں خلل پڑا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ پورے ترکیہ کا پانی استنبول کے لوگوں کو پلایا جا رہا ہے۔

استنبول کے لیے پانی کی فراہمی کبھی کوئی آسان معاملہ نہ تھا۔ ماضی میں اس حوالے سے بہت کوششیں کی گئیں اور اُن زمانوں میں پروان چڑھایا جانے والا پانی کی فراہمی کا بنیادی نظام آج بھی موجود ہے۔ اُسے سمجھنے سے استنبول کو پانی کی

فراہمی کے معاملات کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

یونانی فلسفی تھیمسٹیس نے چوتھی صدی عیسوی میں شہر کی پیاس کا ذکر کیا تھا اور یہ شہر استنبول تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک فلسفی نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ استنبول کبھی پانی کے بڑے بحران کی زد میں آئے گا۔ استنبول کو پانی کی فراہمی کے قدیم نظام کو مشاہدہ آج بھی کیا جا سکتا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی کے زمانے میں استنبول میں قائم کیا جانے والا پانی کا نظام آج بھی موجود ہے اور اس کا ایک جُز ایک مرکزی شاہراہ سے یوں گزرتا ہے جیسے قوسِ قزح۔

یہ اکتوبر کا دن ہے۔ کریم آلتغ سلطان احمد نامی علاقے میں جزیرہ نما استنبول کی خشک پڑی ہوئی آبی ذخیرہ گاہ بنہر دیریک سسٹرن میں گھوم رہا ہے۔ بنہر دیریک سسٹرن کا مطلب ایک ہزار ایک حوض۔ ویسے اِس میں ۲۲۴ حوض ہیں۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ سلطنتِ عثمانیہ کے دور میں یہاں بجلی نہ ہونے کے باعث گھپ اندھیرا ہوا کرتا تھا اور لوگ سمجھتے تھے کہ اِن ستونوں کی کوئی انتہا نہیں۔ کریم آلتغ ماہرِ آثارِ قدیمہ اور تعمیرات کے تاریخ دان ہیں۔ وہ بازنطینی سلطنت کے دور میں پانی کی فراہمی کے نظام کے حوالے سے زیادہ تحقیق کرتے رہے ہیں۔

رومن سلطنت کے دور میں ایک چھوٹا قصبہ آباد کیا گیا جسے کانسٹنٹائن دی گریٹ سے موسوم کیا گیا۔ کانسٹنٹائن دی گریٹ پہلا رومن شہنشاہ تھا جس نے عیسائیت قبول کی۔ اُس نے ۷۰۰ ارسال قبل جو قصبہ قائم کیا، وہ بعد میں قسطنطنیہ میں تبدیل ہوا۔ بہت کم وقت میں اِس کی آبادی بہت زیادہ تیزی سے بڑھی۔ اس شہر کو پانی کی فراہمی میں تواتر یقینی بنانے کے لیے رومن سلطنت نے قدیم روم کا سب سے بڑا پانی کی فراہمی کا نظام تیار کیا۔ اس میں شہر کے مغرب میں واقع جنگلات میں واقع آبی ذرائع کا پانی بھی شامل ہوتا جاتا رہا۔ قسطنطنیہ بہت منفرد ہے۔ کریم آلتغ کہتے ہیں کہ پانچویں اور پندرہویں صدی عیسوی کے دوران بازنطینی سلطنت کے تحت ہزاروں زیرِ زمین حوض تعمیر کیے گئے۔

جدید شہر میں تاریخ اب بھی دکھائی دیتی ہے۔ اب بھی کم وبیش ۲۰۰ حوض پائے جاتے ہیں۔ یہ بڑے پیمانے پر پانی کو ذخیرہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ سب جزیرہ نما استنبول کے نیچے ہیں۔ اِن میں سے بہت سے اس وقت پُرانی حالت میں ہیں یعنی کھدائی نہیں کی گئی اور چند ایک کو بحال کیا گیا ہے جن میں بنہر دیریک سسٹرن بھی شامل ہے۔ استنبول کو پانی فراہم کرنے کے نظام کی کہانی ماضی اور حال کے حسین سنگم کا نام ہے۔ کریم آلتغ بنہر دیریک سسٹرن کے ستونوں کو چُھو کر بتاتے ہیں کہ یہ پانچویں صدی عیسوی میں تعمیر کیے گئے تھے اور اب تک کھڑے ہیں۔ یہ تو گزرے ہوئے زمانوں کی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ اثاثہ اور خزانہ بھی ہیں۔ اِسے انجینئرنگ کا شاہکار کہیے۔ اِس سے پتا چلتا ہے کہ انسان میں کتنی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور وہ کیا کیا کر سکتا ہے۔ اگر اب بھی شہر میں اِسی نوعیت کے ذخائر تعمیر کیے جائیں تو بارش کے پانی کو ذخیرہ کرنے کے ساتھ ساتھ شہر میں سیلابی کیفیت کو بھی روکا جا سکتا ہے۔

ماضی سے سیکھنا بہت مفید معاملہ ہے کیونکہ ہم ماضی کے بیشتر تجربات اور کامیابیوں سے موجودہ دور اور مستقبل کے حوالے سے اِتنا کچھ سیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے معاملات کی درستی میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ یونیورسٹی آف ایڈنبرگ میں رومن اور بازنطینی آثارِ قدیمہ کے پروفیسر ایمیریٹس جم کرونے ترکیہ میں عشروں پہلے کام شروع کیا۔ ۱۹۹۴ء میں انہوں نے استنبول کے مغرب میں واقع اینٹیشن والز میں دلچسپی لینا شروع کیا۔ جب وہاں کھدائی کی گئی تو زیرِ زمین آبی ذخائر کا نیٹ ورک برآمد ہوا۔ یہ گھنے جنگل کا علاقہ ہے۔

۲۰۲۱ء میں جم کرونے الہان اورانقرہ کی مڈل ایسٹرن ٹیکنیکل یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر اینڈر ریپکر کے ساتھ مل کر برٹش انسٹیٹیوٹ انقرہ کے اشتراکِ عمل سے ایک منصوبے پر کام شروع کیا۔ بارش کے پانی کو ذخیرہ کر کے استنبول کی آبادی کی ضرورت پوری کرنے کے حوالے سے اِن لوگوں نے وسیع البنیاد تحقیق کی۔ اس تحقیق کا بنیادی مقصد استنبول کے لیے بارش کے زیادہ سے زیادہ پانی کو محفوظ کرنے کی جامع حکمتِ عملی تیار کرنا تھا۔

محققین یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ استنبول کے لیے پانی ذخیرہ کرنے کا یہ نظام کن بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا اور سیکڑوں برس بعد بھی اِس کے برقرار رہنے کا سبب کیا ہے۔ اینڈر ریپکر نے بتایا کہ الہان کے ساتھ مل کر انہوں نے موجودہ چیلنجز کی روشنی میں امکانات کا جائزہ لیا۔ ماضی سے بہت کچھ سیکھتے ہوئے موجودہ چیلنجز سے نپٹنے اور مستقبل کے لیے بہت کچھ کر گزرنے کی سوچ کے ساتھ کام کیا گیا۔

بارش کے پانی کو چھتوں پر بھی جمع کیا جاتا ہے اور زمین پر بہت سے کھلے مقامات پر بھی ذخیرہ گاہیں بنائی جاتی ہیں تاکہ پانی جمع رہے۔ چھتوں پر جمع کیے جانے والا پانی غسل خانوں، بیت الخلا اور گھریلو باغیچوں میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ جگہ جگہ بنائی جانے والی ذخیرہ گاہوں کا پانی گلیوں اور سڑکوں کی دھلائی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حال ہی میں ایک قانون بھی نافذ کیا گیا ہے جس کے تحت بہت سے عمارتوں کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے کہ چھتوں پر بارش کا پانی جمع کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ بلڈرز کی طرف سے اس حوالے سے مزاحمت کا سامنا ہے کیونکہ بارش کا پانی جمع کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کے لیے عمارتوں کی مخصوص ڈیزائننگ لازم ہے۔ اینڈر ریپکر کا کہنا ہے کہ بارش کے پانی کو بہت بڑے پیمانے پر ذخیرہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا یا پیدا کروانا بہت بڑا کام ہے جو آسانی سے بھی نہیں ہو سکتا اور مزاحمت کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بہت سے شہروں میں بعض مخصوص مقامات پر پانی کو جذب کرنے اور بعد میں کشید کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ آبی ذخیرہ گاہوں سے ملحق زمین کو اس مقصد کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ استنبول میں بھی ایسا ممکن ہے۔ سوال منصوبہ سازی کا ہے۔ استنبول میں پارک لینڈز بہت ہیں اور اُن میں پانی کو ذخیرہ کرنے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے مگر اب بہت سے ایسے کھلے مقامات پر کنکریٹ کی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں جس کے نتیجے میں بارش کا بیشتر پانی سمندر میں چلا جاتا ہے۔ اس پانی کے ایک بڑے حصے کو زمین میں جذب ہونے دینا چاہیے مگر ایسا نہیں کیا جا رہا۔ دنیا بھر میں ایسے شہر بڑی تعداد میں ہیں جو پانی کو قدرتی طور پر ذخیرہ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہیں۔ لاس اینجلس اور بنکاک میں ایسا نظام بہت اچھی حالت میں پایا جاتا ہے۔ نیوزی لینڈ کے ایک شہر کو بھی پانی ذخیرہ کرنے کی صلاحیت کا حامل بنایا گیا اور اس حوالے سے بی بی سی کی دستاویزی فلم بھی موجود ہے۔

جب کسی شہر کی آبادی بڑھتی ہی جاتی ہے تب قدرتی وسائل پر دباؤ بڑھتا جاتا ہے اور شہر کا نظم ونسق دشوار ہوتا چلا جاتا ہے۔ پانی اور دیگر بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے نظام پر بڑھنے والا دباؤ مقامی اداروں کو عوام کی توقعات پر پورا اترنے نہیں دیتا۔ استنبول میں پانی کی قلت کا ایک واضح اثر شہر کے مضافاتی علاقوں اور دور افتادہ علاقوں پر بھی مرتب ہوا ہے۔ اِن علاقوں کے حصے کا پانی بھی استنبول کو دیا جاتا رہا ہے۔ میلین ڈیم سے ملحق دیہات کی زرعی زمینوں کے لیے پانی کی فراہمی اب ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ استنبول میں پانی کی طلب چونکہ بہت زیادہ ہے، اس لیے کئی علاقوں کو پانی سے

محرومی کی مصیبت جھیلنا پڑ رہی ہے۔ اس کے لیے بنیادی ڈھانچا موجود ہے جو اِدھر اُدھر سے پانی کھینچ کر استنبول کی طرف رواں کرتا ہے۔

الہان کا کہنا ہے کہ پانی کی بڑھتی ہوئی طلب نے معاملات کو بہت الجھا دیا ہے۔ استنبول کے لیے پانی کی یومیہ طلب کے مطابق رسد میں کمی نہیں کی جاسکتی۔ اگر استنبول میں پانی کا ایک دن کا ناغہ بھی متعارف کرایا جائے تو حکومت کے لیے عدمِ استحکام کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔ کوئی بھی مقامی حکومت پانی کے کوٹے میں کمی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

اینڈر ریپکر کا کہنا ہے کہ جب کسی بڑے شہر کو پانی کی فراہمی جاری رکھنے کے لیے اردگرد کے علاقوں سے پانی کھینچ کر لایا جاتا رہے تو بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں زرعی زمینوں کے لیے خاص طور پر پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔

جودی ہاربرٹ اور اُن کے شوہر سردار نے دی سسٹینیبل اربن ڈیولپمنٹ پلیٹ فارم کے زیرِ عنوان ایک غیر سرکاری تنظیم قائم کی ہے، جو مقامی مسائل کو احسن طریقے سے حل کرنے کے حوالے سے رہنمائی بھی کرتی ہے اور عملی سطح پر متحرک ہونے کی تگ و دَو بھی کرتی ہے۔ ایک بڑا اقدام مقامی سطح پر شروع کیا جانے والا سائل اوئسز پراجیکٹ ہے۔ یہ منصوبہ پینی کوئے نامی دریا سے متعلق ہے جو سیاحت، تعلیم اور تحفظِ ماحول کو ایک پلیٹ فارم پر لاتا ہے۔ بنیادی مقصد ایک سبز راہ کا قیام ہے۔ برطانیہ کے اِپسوِچ اوئسز نامی منصوبے سے تحریک پانے والے اس منصوبے کا بنیادی مقصد دریا کے کناروں کے گرد بفرزون قائم کرنا ہے۔ بلڈرز نے ایسا نہیں کیا تھا۔ بفرزون کے قیام سے قدرتی ماحول کی بقا ممکن تھی اور مقامی کاروباری اداروں اور سیاحت کے لیے بھی پنپنے کی گنجائش پیدا ہوسکتی تھی۔

اس غیر سرکاری تنظیم نے ستمبر کے اواخر میں ڈپٹی میئر سے ملاقات کی اور اپنی تجاویز پیش کیں۔ ڈپٹی میئر کو معاملے کی سنگینی کا اندازہ تھا اور وہ عملی طور پر بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر مسئلہ سیاسی ارادے کا بھی تو تھا۔ کسی بھی بڑے شہر میں بہت بڑے پیمانے کے بنیادی ڈھانچے والے منصوبہ شروع کرنا اور عمدگی کے ساتھ تکمیل سے ہمکنار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ترکیہ جیسے جمہوری معاشرے میں مکمل اتفاقِ رائے کے بغیر کسی بھی بڑے منصوبے کا شروع کیا جانا انتہائی دشوار ثابت ہوتا رہا ہے۔ سیاسی معاملات میں پیچیدگی بہت زیادہ پائی جاتی ہے اور اِسی لیے بہت سے اہم منصوبے تاخیر کا شکار ہوکر افادیت کھو بیٹھتے ہیں۔

اینڈر ریپکر کا کہنا ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ ہم بھرپور علم اور مہارت رکھتے ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ ایسا حکومتی نظام کس طور قائم کیا جائے جس میں کسی بھی اہم منصوبے کے لیے حتمی فیصلہ بروقت ہو اور منصوبے کی افادیت متاثر نہ ہو۔ اُن کے خیال میں اتفاقِ رائے اس لیے لازم ہے کہ سیاسی محاذ آرائی بہت زیادہ ہے۔ مقامی اداروں اور متعلقہ وزارت کے درمیان مکمل ہم آہنگی کا پایا جانا لازم ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"What happens if Istanbul's water supplies run dry?" ("bbc.com". February 21, 2025)

تِجارت میں دَھونس کا زمانہ گیا

Jessica Durdu

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے بڑے حصے پر امریکا کا راج رہا۔ اور اکیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں بھی امریکا ہی نے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں رکھا۔ یہ سب کچھ تب تک ممکن تھا جب تک ٹیکنالوجی کا بم نہیں پھٹا تھا۔ اب بلی تھیلے سے باہر آچکی ہے۔ دنیا بھر میں ٹیکنالوجی کا غلغلہ ہے۔ امریکا کی تکنیکی بالادستی داؤ پر لگ چکی ہے۔ یورپ بھی اس معاملے میں غیر معمولی یا قابلِ رشک پوزیشن میں نہیں رہا۔ اُسے اپنی فکر لاحق ہے۔ جو کچھ بھی یورپ کے اردگرد ہو رہا ہے، وہ تمام ہی یورپی اقوام کو انتہائی خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

یورپ کے لیے ایک بار پھر بقا کا سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ امریکا نے یوکرین جنگ کے حوالے سے اب جو رویہ اپنایا ہے، وہ انتہائی خطرناک ہے کیونکہ صدر ٹرمپ کہہ چکے ہیں کہ اگر یورپ کو بچاؤ کرنا ہے تو اپنے بل پر کرے۔ یوکرین کو دھمکانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے یورپ کو بھی دھمکایا ہے۔ روس کی طاقت اور جارحانہ مزاج سے پورے یورپ پر خوف طاری ہے۔ صدر ٹرمپ اس خوف کو کیش کرانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش کے طور پر انہوں نے یوکرین کے صدر کے سامنے ایک ڈیل کا خاکہ رکھا ہے۔ اس ڈیل کے تحت یوکرین کو تعمیرِ نو کے لیے امریکا کی طرف سے ۵۰۰/ارب ڈالر کا پیکیج مل سکتا ہے۔ جواب میں یوکرین کو اپنے قدرتی وسائل پر امریکی تصرف قبول کرنا ہوگا۔ امریکا چاہتا ہے کہ یوکرین کی سرزمین میں دبی ہوئی معدنیات جی بھر کر نکالی جائیں اور اُن سے امریکا کو مضبوط بنایا جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ یوکرین کی بقا کا سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ روس اب بھی جنگ ختم کرنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دے رہا، بلکہ اب تو اُسے ٹرمپ کی شکل میں ایک اچھا دوست بھی مل گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ دونوں ملکوں نے یوکرین کو ایک طرف ہٹا کر یوکرین جنگ کے حوالے سے سعودی عرب میں مذاکرات کیے ہیں۔ اِن مذاکرات پر ایک دنیا کو حیرت ہے اور بجا طور پر حیرت ہے۔ ان مذاکرات میں یوکرین کو شریک نہ کرنا انتہائی مشکوک اور خطرناک بات ہے۔ دونوں بڑی طاقتیں کیا طے کررہی ہیں؟ صدر ٹرمپ نے جو لب ولہجہ اختیار کر رکھا ہے وہ انتہائی پُراسرار اور خطرناک ہے۔ یوکرین کے صدر وولودومیر زیلنسکی نے امریکی ڈیل مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس حوالے سے کوئی بھی فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا جائے گا۔

بین الاقوامی تجارت اور مجموعی عالمی معیشت کے حوالے سے معاملات ایک عشرے پہلے کے معاملات کے مقابلے میں بہت مختلف دکھائی دے رہے ہیں۔ دنیا بہت بدل گئی ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کسی نہ کسی سطح پر مل کر باقی ماندہ دنیا کو ابھرنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں۔ پسماندہ ممالک کے مقدر میں تو شاید حالات کی چکی میں پسنا لکھ دیا گیا ہے۔

ایک عشرہ قبل جو کچھ تھا، وہ اب دکھائی نہیں دے رہا۔ اقوامِ عالم کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ چند ایک ممالک اب بھی پُرانے ہتھکنڈوں کے ساتھ میدان میں ہیں۔ امریکا بھی اُن میں شامل ہے۔ وہ اب بھی دھونس دھمکی کے ذریعے کام نکالنے کے موڈ میں دکھائی دے رہا ہے۔ اس معاملے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے، اِس کے بارے میں پورے یقین سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ امریکی قیادت اب بھی انیسویں اور اٹھارہویں صدی کے ہتھکنڈوں کو بروئے کار لانے پر بضد دکھائی دے رہی ہے۔ صدر ٹرمپ اقتصادی پابندیوں اور ٹیرف یعنی درآمدی ڈیوٹی کے ذریعے ایک دنیا کو خوفزدہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ ایسا کرنے سے امریکا کے لیے پیدا ہونے والی تمام معاشی مشکلات ختم ہوجائیں گی۔

دوسری بار امریکی صدر کا منصب سنبھالتے ہی ڈونلڈ ٹرمپ نے دھمکی دی تھی کہ اگر برکس کے ارکان نے امریکی کرنسی یعنی ڈالر سے ہٹ کر کسی اور کرنسی میں کاروبار شروع کیا تو امریکا اُن پر ۱۰۰ فیصد ٹیرف عائد کردے گا۔ (اب وہ ان ممالک پر ۱۵۰ فیصد ٹیرف عائد کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔) چین کی غیر علانیہ قیادت میں کئی ممالک مل کر ایک ایسا مالیاتی نظام لانا چاہتے ہیں جو ڈالر سے دور ہو یعنی مغربی اقوام کے تصرف والے مالیاتی نظام کے مقابلے میں متوازی نظام لانے کی تیاریاں جاری ہیں۔ روس اور چین اس معاملے میں قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں۔ امریکی قیادت ڈالر کو خیر باد کہنے کا ارادہ رکھنے والے ملکوں کو دھمکاتی آئی ہے۔ بائیڈن انتظامیہ بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں رہی تھی۔ صدر بائیڈن نے بھی برکس کے ارکان کو خبردار کیا تھا کہ اگر وہ ڈالر سے خود کو الگ کریں گے تو اُن کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔

چین نے بارہا وضاحت کی ہے کہ برازیل، روس، بھارت، چین اور جنوبی افریقا پر مشتمل یہ تنظیم یعنی برکس کسی بھی معاملے میں محاذ آرائی کے لیے نہیں بنائی گئی۔ اس تنظیم یا بلاک کے قیام کا بنیادی مقصد چند ہم خیال ممالک کے درمیان دوستی، مفاہمت اور اقتصادی اشتراکِ عمل کو فروغ دینا ہے۔ چین کہتا ہے کہ یہ بلاک کسی کے خلاف نہیں کیونکہ اِس کا بنیادی مقصد کسی کو پچھاڑنا نہیں۔ اس بلاک کے ارکان آپس میں اپنی اپنی کرنسی کے ذریعے تجارت کرنا چاہتے ہیں۔

معاملہ یہ ہے کہ دنیا اب نہ تو ڈالر یا کسی اور کرنسی کی بالادستی قبول کرنے کے لیے تیار ہے اور نہ ہی وہ پابندیوں کے حوالے سے دی جانے والی دھمکیوں ہی کو خاطر میں لانے کے لیے تیار ہے۔ اس معاملے میں سب سے نمایاں مثال روس کی ہے جس نے کئی مواقع پر انتہائی نوعیت کے اقتصادی اقدامات کا سامنا کیا ہے مگر پھر بھی اپنی راہ سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوا ہے۔ پہلے ۲۰۱۴ء میں اور اس کے بعد ۲۰۲۲ء میں امریکا اور یورپی یونین نے روس پر غیر معمولی نوعیت کی اقتصادی پابندیاں عائد کیں۔ اِن پابندیوں کا بنیادی مقصد روس کی معیشت کو انتہائی کمزور کرنا تھا مگر روس کسی نہ کسی طور سلامت رہا اور اُس نے علاقائی سطح پر اپنی پوزیشن بھی بہتر بنالی۔ یہ سب کچھ امریکا اور یورپ کے لیے انتہائی پریشان کن تھا۔ روس اگرچہ اب بھی عالمی معیشت میں پیچھے ہے مگر اُس نے اپنے لیے ایک اچھی لائف بوٹ تیار کرلی ہے۔ عالمی معیشت کے سمندر میں اٹھنے والے طوفانوں کا سامنا کرنے کی بھرپور تیاری کے ساتھ وہ میدان میں ہے۔ عالمی تجارت میں رقوم کی منتقلی کے لیے امریکا اور یورپ کا متعارف کرایا ہوا نظام SWIFT مستعمل ہے۔ روس نے اِس کے متبادل کے طور پر سسٹم فار ٹرانسفر آف فنانشل میسیجز یعنی ایس پی ایف ایس تیار کیا۔ ساتھ ہی ساتھ روس نے ۲۰۱۷ء میں Mir کے نام سے پے منٹ کارڈ بھی عالمی مارکیٹ میں پیش کیا۔ یہ کارڈ امریکا کے ویزا اور ماسٹر کارڈ کی طرز پر کام کر رہا ہے۔ اِن اقدامات سے روسی معیشت کو بیرونی جھٹکوں سے محفوظ رکھنے میں خاصی مدد ملی ہے۔ غیر مغربی اتحادی مثلاً ترکیہ، قازقستان اور مشرقِ وسطیٰ کے چند ممالک سے گہرے معاشی اور مالیاتی تعلقات قائم کرنے میں روس کو بہت مدد ملی ہے۔ اب روس کو ہر معاملے میں مغرب کے تیار کردہ یا اُس کے تصرف والے مالیاتی نظام پر انحصار پذیر نہیں ہونا پڑتا۔

امریکا نے ٹیکنالوجی تک ترکیہ کی رسائی بھی محدود کردی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ترکیہ کو امریکی لڑاکا ایف۔۳۵ طیاروں اور غیر انسان بردار طیاروں کی فراہمی کے علاوہ آلات اور مشینری کی فراہمی بھی محدود کرڈالی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ اب ترکیہ اِن میں بہت سی چیزیں اپنے وسائل سے تیار کر رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُس نے مشرقِ وسطیٰ اور دیگر خطوں کے ممالک کو فوجی ساز و سامان کی فروخت بھی شروع کردی ہے۔ اس حوالے سے ترکیہ نے افریقا میں تیزی سے قدم جمانے کی منصوبہ سازی کی ہے۔

روس اور ترکیہ نے جس عمدگی سے امریکی اقدامات کے سامنے مزاحمت کی ہے، وہ برفانی تودے کے محض سِرے یا نوک کے مترادف ہے۔ اب مزید بہت سے اقوام چاہتی ہے کہ دنیا کے معاملات برابری کی بنیاد پر چلائے جائیں یعنی چند انتہائی مضبوط ممالک باقی دنیا کو مٹھی میں لینے کی کوشش نہ کریں اور دوسروں کو بھی ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہونے دیں۔ اس کے لیے ایسے نئے عالمی نظام کی ضرورت ہے، جس میں سب کے لیے احترام اور مساوات ہو یعنی زندہ رہنے کا بنیادی حق سب کے لیے ہو اور اپنے اپنے وسائل کی حدود میں رہتے ہوئے سبھی کو معاشی و معاشرتی استحکام سے ہمکنار ہونے کا موقع دیا جائے۔

گزشتہ برس برازیل میں جی۔۲۰ سربراہ کانفرنس ہوئی۔ اِس پہلی بار افریقی اتحاد کی تنظیم نے بھی مکمل رکن کی حیثیت سے شرکت کی۔ اب جی۔۲۰ محض چند ترقی یافتہ اور مضبوط ممالک کا اتحاد نہیں بلکہ یہ ایک نئے وژن کا حامل گروپ ہے جو دنیا کو بہت حد تک بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

برکس کے ارکان نے بھی عالمی تجارت کے اصولوں کو ازسرِنو ترتیب دینا اور اِس حوالے سے تحریک چلانا شروع کردیا ہے۔ یہ ممالک چاہتے ہیں کہ عالمی تجارت میں کوئی ایک یا چند بڑے ممالک تمام معاملات پر متصرف نہ ہوں بلکہ سب کو تجارت کے حوالے سے کھل کر کام کرنے کا موقع اور میدان دیا جائے۔ برکس کے ارکان نے باہمی تجارت کے لیے اپنی اپنی کرنسیوں کی طرف دیکھنا شروع کردیا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ڈالر پر اُن کا انحصار زیادہ سے زیادہ کم ہو۔ برازیل اور چین کے درمیان تجارت اب اُن کی اپنی کرنسیوں میں ہوتی ہے۔ یہ اقدام امریکا کے لیے انتہائی پریشان کن ہے اور یورپی یونین بھی اس حوالے سے کم پریشان نہیں۔ بھارت اور چند دیگر علاقائی ممالک بھی اِنہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ مغربی دنیا نے عالمی مالیاتی نظام کے ذریعے دنیا بھر کی تجارت کو اپنی مٹھی میں لے رکھا ہے۔ چین، روس اور دیگر برکس ارکان نے اس بالادستی کو ختم کرنے کی طرف قدم بڑھانا تیز کردیا ہے۔ دی برکس نیو ڈیولپمنٹ بینک نے مالیاتی منصوبوں کو مقامی کرنسیوں میں آگے بڑھانے کا عمل تیز کردیا ہے تاکہ مغربی مالیاتی اداروں پر انحصار کم کیا جاسکے۔ ساتھ ہی ساتھ برکس کے ارکان اپنا بلاک چین پے منٹ سسٹم تیار کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ یہ محض کوئی سیاسی بیان نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ تصور ہے۔ دنیا نے ڈالر کی بنیاد پر کھڑے ہوئے نظام کو کئی بار لڑکھڑاتے اور گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ عالمی مالیاتی نظام اور عالمی معاشی ڈھانچے پر جب بھی بحرانی کیفیت طاری ہوتی ہے تب بیسیوں معیشتیں ڈانواڈول ہونے لگتی ہیں۔

۲۰۰۸ء کا عالمگیر مالیاتی بحران ہو یا کووڈ کے ہاتھوں پیدا ہونے والی کساد بازاری، اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ڈالر پر بہت زیادہ بھروسا کرنا کسی بھی اعتبار سے دانشمندی نہیں۔ اس میں خطرات بہت زیادہ ہیں۔

ویسے چین، روس، برازیل اور برکس کے دیگر ارکان کے اقدامات کا مقصد ڈالر کو ختم کرنا نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے عالمی مالیاتی نظام بہت زیادہ خرابی کا شکار ہے اور اس کے نتیجے میں پہلے ہی بحرانی کیفیت کا شکار مالیاتی منڈیوں کی حالت مزید خراب ہوجائے گی۔ ڈالر پر انحصار اس لیے کم کیا جارہا ہے کہ دیگر کرنسیوں کو بھی عالمی مالیاتی نظام میں جگہ مل سکے۔ یورپ اور امریکا کی کرنسیوں سے ہٹ کر چینی، جاپانی، روسی،

بھارتی، سعودی، اماراتی اور کویتی کرنسی کے لیے بھی پنپنے کی گنجائش ہونی چاہیے۔ ترکیہ ایک مضبوط ملک ہے۔ اُس کی کرنسی کو بھی اس بات کا حق حاصل ہے کہ عالمی مالیاتی نظام میں اُس کی پوزیشن مضبوط ہو۔ پوری دنیا کی تجارت کو ڈالر سے باندھے رکھنا کسی بھی اعتبار سے عقل کا سَودا نہیں۔ اس صورت میں امریکا کی پالیسیاں بھی پوری دنیا کو جھیلنی پڑتی ہیں۔ ڈالر کے استحکام کا امریکی حکومت بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔

اگر کوئی ایک بڑی کرنسی ناکام ثابت ہوتی ہے تو دنیا بھر کے ممالک کو اپنی اپنی کرنسی میں یا پھر متبادل کرنسیوں میں تجارت کرنا ہوگی۔ ایک کرنسی پر انحصار کرنے کی صورت میں بہت کچھ الٹ پلٹ سکتا ہے اور ایسا ہوتا رہا ہے۔ امریکی ڈالر پر مکمل انحصار نے دنیا کو کئی بار بحرانی کیفیت سے دوچار کیا ہے۔ ڈالر کا بہت زیادہ استحکام بھی مسائل پیدا کرتا ہے۔ ڈالر کی قدر میں گراوٹ بھی مشکلات کو جنم دیتی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے تبدیلی کو واقع ہونا ہے۔ ایک کرنسی کے تصرف اور تسلط کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب عالمی تجارت کے لیے ایک ایسا مالیاتی نظام درکار ہے جس میں کئی کرنسیاں ساتھ ساتھ کام کریں اور اُن کے درمیان پورا توازن برقرار رکھنے پر توجہ دی جاتی رہے۔ چین کی کرنسی ریمنبی بہت تیزی سے بین الاقوامی سطح پر اہمیت حاصل کرتی جارہی ہے۔ اب آئی ایم ایف نے اُسے اسپیشل ڈرائنگ رائٹس باسکٹ کا حصہ بھی بنادیا ہے۔ روس کا میر سسٹم بھی بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ دنیا بھر میں اس سسٹم کو قبولیت مل رہی ہے، لوگ اِس پر اعتماد کر رہے ہیں۔ ایشیا کی سطح سے شروع ہونے والا یہ نظام اب پوری دنیا میں اپنایا جارہا ہے۔ برکس کی حدود سے باہر کے ممالک بھی میر سسٹم کی اہمیت کو محسوس کر رہے ہیں۔ وہ بھی اب مقامی کرنسیوں میں کاروبار کر رہے ہیں تاکہ ڈالر پر انحصار کم کیا جاسکے۔

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اب دھمکی اور پابندیاں قابلِ اعتماد ہتھیار نہیں ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب ایسے اقدامات سے صرف منفی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ امریکا نے ڈالر کو زیادہ مضبوط بنانے اور باقی دنیا پر اُسے مسلط کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی ہیں، اُن کے نتیجے میں دنیا بھر میں ڈالر سے نجات پانے کی کوششوں میں تیزی آئی ہے۔ ڈالر کو سب سے بڑی کرنسی کے طور پر برقرار رکھنے کی امریکی کوششوں نے ایک دنیا کو دیگر کرنسیوں کی طرف متوجہ ہونے کی تحریک دی ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۱ \\\\\\

جمہوریت کی بقا کا سوال

Josef Ernst

دنیا بھر میں ایک طرف تو معاشی نمو کی شرح گر رہی ہے اور دوسری طرف سماجی سطح پر بڑھتی ہوئی بے چینی سے انصاف اور شفافیت کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔

مغربی دنیا کو جو وسیع تر بحران لاحق ہے، اُسے سمجھنے کے لیے معاشی نمو کی گرتی ہوئی شرح کو سمجھنا لازم ہے۔ اِس کے بغیر مغرب کی الجھنوں کے بارے میں بالکل درست رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ معاشی اور معاشرتی سطح پر وسائل کی ازسرِ نو تقسیم کی گنجائش سکڑتی جارہی ہے اور بہت سے لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انصاف کے بارے میں اُن کے احساسات بُری طرح مجروح ہو رہے ہیں۔

انصاف ایک پیچیدہ اور بسا اوقات کچھ کا کچھ سمجھ میں آنے والا تصور ہے۔ یہ قانون کی بنیاد پر استوار ہے مگر اِس کی رسائی قانون کے دائرہ کار سے آگے بھی ہے اور آج کی دنیا میں یہ بہت حد تک ایسے سماجی پروگراموں کے ذریعے خود کو ظاہر کرتا ہے جن کا بنیادی مقصد معاشروں میں مساوات کو فروغ دینا ہے۔

معاملات کو سیاسی سطح پر مزید الجھانے والی بات یہ ہے کہ انصاف کی آواز بالعموم اُن لوگوں کی طرف سے اٹھائی جاتی ہے جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن سے کچھ غلط کیا گیا ہے، زیادتی کی گئی ہے۔ غلط کا مفہوم ہر ایک کے نزدیک الگ الگ ہے۔ ہر انسان ناانصافی کو اپنے حالات کے مطابق ایک خاص تناظر میں دیکھتا ہے۔ ناانصافی کے حوالے سے ہر انسان کا تصور الگ ہے اور بیشتر معاملات میں اِس حوالے سے طویل بحث کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی جامعہ طے نہیں کرسکتی کہ انصاف آخر ہے کیا، اِس کے حقیقی اور واقعی معیارات کیا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ آج بھی انصاف بہت حد تک اور بہت گہرائی میں ذاتی نوعیت کا تصور ہے جس پر بہت لے دے ہوتی ہے۔

اب بنیادی سوال یہ ہے کہ بالکل درست معاملہ کیا ہوتا ہے، ہر اعتبار سے بالکل شفاف معاملہ کیا ہوتا ہے۔ کیا یہ درست ہوگا کہ ہم شفافیت اور درستی کو سماجی سطح پر ہم آہنگی کا ایک عامل سمجھیں۔ انصاف کے برعکس کسی چیز کے درست سمجھنے اور منوانے کا معاملہ بہت حد تک انفرادی سطح پر اخلاقی معاملہ ہوتا ہے۔

لوگ عام طور پر کسی بھی معاملے میں انصاف یا شفافیت کا تعین اپنے اپنے وجدان کی مدد سے کرتے ہیں۔ کسی بھی معاملے میں اختلافِ رائے ہوسکتا ہے اور ہوتا ہی ہے۔ لازم نہیں کہ کوئی کسی معاملے کو درست سمجھ رہا ہو تو باقی سب لوگ بھی اُسے درست سمجھیں یا ایسا کرنے کا عندیہ دیں۔

شفافیت عدمِ شفافیت کو محض الگ نہیں کرتی بلکہ اُسے تسلیم بھی کرتی ہے۔ بحث و تمحیص کے ذریعے طے پانے والے اصولوں کی بنیاد پر استوار ہونے کے بجائے یہ ذاتی احتساب کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔

انصاف کا عمل بالعموم رسمی نوعیت کے سمجھوتوں اور حقوق کی ضمانت کا حامل ہوتا ہے۔ اِسی صورت شہریوں کے لیے اندرونی و بیرونی سلامتی یقینی بنائی جاسکتی ہے۔

کسی بھی نوعیت کی دخل اندازی انتشار اور بدحواسی کو جنم دیتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ غلط راہ پر گامزن کیے جانے والے احساسات عام طور پر سیاست میں انتشار اور بدحواسی کو راہ دیتے ہیں۔ معاشرے کی ساخت اور مجموعی کیفیت میں زوال کے حوالے سے یہ دونوں اپنا اپنا کردار بخوبی ادا کرتے ہیں۔ ایسے میں قربانی کے بکرے تلاش کیے جاتے ہیں یعنی کرے کوئی اور بھرے کوئی والی کیفیت پیدا کی جاتی ہے۔ جب کسی کو کسی ٹھوس جواز کے بغیر نشانہ بنایا جاتا ہے، زیادتی کی جاتی ہے تب مخالفت اور مخاصمت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

امریکی جمہوریت کو پوری دنیا کے لیے ایک نمایاں مثال بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکی جمہوریت ایک بڑا نمونہ نہیں ہے مگر مسئلہ یہ ہے کہ اِس میں بھی بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں اور یہ کہنا کسی طور بجا نہ ہوگا کہ امریکی جمہوریت ہر طرح کی خامیوں اور کمزوریوں سے پاک ہے۔

اس وقت امریکا میں جس نوعیت کی جمہوریت پائی جاتی ہے، وہ بہت پیچیدہ بھی ہے اور باقی دنیا کے لیے پوری طرح قابلِ تقلید بھی نہیں۔ امریکی ماڈل کو پورا کا پورا اپنانا کسی بھی ملک یا معاشرے کے لیے کسی بھی طور درست نہیں۔ امریکی سیاست کے تضادات دنیا بھر میں لوگوں کو پریشان کر رہے ہیں کیونکہ اب تک امریکی جمہوریت ہی کو ماڈل سمجھا جاتا رہا ہے۔ جس چیز کو ماڈل سمجھا جاتا ہو، اُس میں اگر کوئی بڑی خرابی یا خرابیاں

دکھائی دیں تو ذہنوں میں خلفشار کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یورپ کے جمہوری ماڈل کو کیا سمجھا جائے؟ اس وقت یورپ دو بڑے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ ایک معاملہ ہے تارکینِ وطن کو کنٹرول کرنے کا اور دوسرا معاملہ ہے انصاف کے بنیادی تصور کو حقوق کے غیر مشروط احساس سے جوڑنے کا۔ یورپ کی جمہوریت اِس لیے بہت مختلف ہے کہ وہ معاشرے تعلیم یافتہ ہیں اور شہریوں کی سوچ بہت سے ایسے معاملات میں بہت مختلف ہے جو باقی دنیا ڈھنگ سے سمجھے نہیں جاتے۔ یورپ میں بہت سے معاملات اٹکے ہوئے ہیں۔ بہت سے اشوز کو ڈھنگ سے نپٹایا نہیں گیا۔ سیاسی سطح پر بہت سے معاملات الجھے ہوئے ہیں۔ بہت سے حقیقتیں خاصی مبہم ہوچکی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھا جانا چاہیے کہ ماضی کی تفہیم ہمارے لیے انتہائی دشوار اور پریشان کن ہوتی جارہی ہے۔

یورپ میں عمومی سطح پر زندگی وحشت زدہ ہے۔ سمت سے محرومی کا احساس بہت نمایاں ہے۔ یورپی معاشرے بظاہر اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں۔ وہ بالکل درست راہ کی تلاش میں ہیں۔ باقی دنیا کے مقابلے میں اُن کی سوچ بہت مختلف ہے۔ صدیوں تک باقی دنیا کے لیے رول ماڈل رہنے کے باعث یورپ کے باشندوں کے ذہن الجھ چکے ہیں۔ ایک طرف اُن کی طاقت گھٹ رہی ہے اور دوسری طرف باقی دنیا کی طاقت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا مسئلہ مؤثر دفاع کا ہے۔ دفاعی صلاحیت سے بظاہر محروم ہونے کے احساس نے یورپ کے باشندوں کو شدید بدحواسی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ایک زمانے سے جاپان کی طرح یورپ بھی اپنے دفاع کے لیے امریکا پر منحصر ہے۔ یورپ کے لوگ اب تک کووِڈ کے بعد کی صورتحال سے نپٹ رہے ہیں۔ اس وبا کے خلاف نام نہاد جنگ نے یورپ کی پالیسیوں کی سمت بدل دی، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ یورپ جامع پالیسیوں سے محروم ہوگیا۔ دولت کی دوبارہ اور منصفانہ تقسیم کا سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے اور آجروں کی مجموعی حالت کو انتہائی وحشت کی نظر سے دیکھنے کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا۔

اس وقت دنیا بھر میں ایک بہت بڑا بحران یہ ہے کہ جمہوریت کو نظر انداز کیا جارہا ہے اور بیوروکریسی کو مضبوط بنایا جارہا ہے۔ یورپ میں اس حوالے سے صورتحال میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ کہیں بیوروکریسی بہت وزنی اور متصرف ہے اور کہیں بیوروکریسی پر منتخب نمائندوں کا تصرف نمایاں ہے۔ جرمنی اِس نوعیت کی تبدیلی کا سب سے زیادہ شکار رہا ہے۔ دیوارِ برلن کے گرائے جانے کے بعد سے اب تک جرمن معاشرے کو شدید دباؤ کا سامنا رہا ہے۔ جرمنی میں سرکاری شعبے کی غیر معمولی اور متواتر توسیع نے نجی شعبے کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے نتیجے میں اگر جرمن معیشت مشکلات سے دوچار رہی ہے تو یہ کوئی بہت حیرت انگیز بات نہیں۔

جرمنی سمیت یورپی یونین کے تمام ہی رکن معاشروں کے لیے اب معاشی بہتری کا زمانہ گزرتا دکھائی دے رہا ہے کیونکہ معاشی معاملات پر سرکاری کنٹرول بڑھتا جارہا ہے۔ امریکا میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ یورپ پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ جمہوری اقدار کمزور پڑ رہی ہیں اور شخصی تصرف کے کیس بڑھ رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جن لوگوں کو اسٹیٹس کو اچھا لگتا ہے یعنی جو زیادہ اور تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کے عادی نہیں ہیں، وہ اس صورتحال سے بہت پریشان ہیں۔ بڑھک مارنے والے یا بڑبولے سیاست دانوں نے معاملات کو کچھ کا کچھ کردیا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کی مثال اِس سلسلے میں سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے معاملات کو کچھ کا کچھ کردیا ہے۔ وہ تیزی سے ایسے اقدامات کرتے جارہے ہیں جو سیاسی سطح پر غیر معمولی اکھاڑ پچھاڑ کا باعث بن رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈونلڈ ٹرمپ، ایلون مسک اور اِسی قبیل کے چند دوسرے سیاست دانوں نے بیوروکریسی کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔ مغربی معاشروں میں بیوروکریسی کے بڑھتے ہوئے تصرف کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا لازم ہوچکا ہے۔ ٹرمپ جیسے سیاست دان بیوروکریسی کی بالادستی کے لیے بہت بڑے خطرے کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ وہ کسی کے زیرِ دست رہتے ہوئے کام کرنے پر یقین نہیں رکھتے۔ عوام کی بھرپور طاقت کے ذریعے خود کو مضبوط بناتے ہوئے یہ سیاست دان اپنی بات منوانے کی تگ و دَو میں مصروف رہتے ہیں۔ یورپی یونین کے رکن ممالک میں اشرافیہ چاہتی ہے کہ معاملات جُوں کے توں رہیں۔ اُسے ڈر ہے کہ عوامی سطح پر غیر معمولی نوعیت کی تبدیلی سے صرف بگاڑ پیدا ہوگا اور یوں معاشروں کا زوال شروع ہوگا۔

مغربی معاشروں میں بیوروکریسی مخالف رویہ اس قدر اور اِتنی تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے کہ سرکاری شعبہ مجموعی معیشت میں اب محض جزیرہ سا دکھائی دینے لگا ہے۔ بہت سوں کو یہ تبدیلی اس لیے اچھی نہیں لگ رہی کہ اس کے نتیجے میں صرف سرکاری شعبے کے چند اداروں اور لوگوں کو کچھ مل جاتا ہے، باقی لوگ اصلاحِ احوال کے لیے ترستے ہی رہتے ہیں۔

اب ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر جمہوریت کو خطرات لاحق ہیں تو وہ خطرات کون سے ہیں اور کس سے یا کن سے لاحق ہیں۔ جو لوگ جمہوریت کا بھلا چاہتے ہیں اور کچھ نہ کچھ کرنے کے موڈ میں بھی ہیں، اُنہیں سوچنا پڑے گا کہ جمہوریت کو لاحق خطرات کو کس طور دور کیا جاسکتا ہے۔ بنیادی معاملہ جمہوریت کو بچانے کا ہے۔ استحکام کی منزل تو اِس کے بعد آئے گی۔ جمہوریت بنیادی طور پر آزادی کے تصور سے وابستہ ہے اور آزادی اُسی وقت پنپ سکتی ہے جب تحمل اور رواداری کو پروان چڑھایا جائے۔

کوئی بھی جمہوریت حقیقی معنوں میں آزاد اُسی وقت سمجھی جاسکتی ہے جب دلائل کا تبادلہ آسان ہو۔ جب کسی کو اپنے دل کی بات کہنے کی پوری آزادی میسر ہوتی ہے تب جمہوریت کا حُسن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ جمہوریت انسان کو بولنا سکھاتی ہے اور بولنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے۔ معاشروں میں اختلافات کا ابھرنا فطری امر ہے۔ ہر انسان اپنے ذہن سے سوچتا ہے۔ کسی کے ذہن کو پابند نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ایک خاص انداز یا زاویے ہی سے معاملات کو دیکھے اور سوچے۔ آج کی دنیا میں ایک بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہر اعتبار سے آزاد اور غیر جانبدار بحث وتمحیص کی گنجائش برائے نام رہ گئی ہے۔

جمہوریت اجتماعیت کی بات کرتی ہے۔ اِس میں ''میں'' سے کہیں زیادہ اہمیت ''ہم'' کی ہوتی ہے۔ ہم اس حقیقت کو کسی بھی طور نظر انداز نہیں کرسکتے کہ جمہوریت کا بنیادی تصور یہ تھا کہ فرد کو ریاست کے تصرف، تسلط اور جبر سے بچایا جائے۔ فرد اگر اجتماعیت میں گم ہوکر رہ جائے تو زندگی بے وقعت سی ہوجاتی ہے۔ زندگی کی وقعت میں اضافے کے لیے لازم تھا کہ فرد کی انفرادیت کو بچانے کی کوئی سبیل کی جاتی اور جمہوریت کی شکل میں وہ سبیل کی گئی۔ اب معاملہ یہ ہے کہ انفرادیت ٹھکانے لگتی دکھائی دے رہی ہے۔ شخصی آزادی محض دھوکا سا ہے۔ اب اگر کسی کو اپنی انفرادیت برقرار رکھنی ہے تو اُس کے لیے بھی اجتماعیت ہی کا سہارا لینا پڑے گا۔ دنیا بھر میں یہی ہو رہا ہے۔ اگر کوئی تنہا چلنا چاہے تو بہت جلد خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ سب سے ہٹ کر چلنے کی گنجائش ختم ہوتی جارہی ہے۔

اب ایک بنیادی سوال یہ بھی ہے کہ ''میں'' کے مقابل ''ہم'' آخر ہے کیا۔ اب اجتماعیت کی بات ہو تو رہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اجتماعیت کے نام پر بھی محض اختلاف ہی ابھر رہا ہے۔ صدیوں سے قبول کی جاتی رہی اقدار کا حال بہت بُرا ہے۔ ہم اجتماعیت کے نام پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑے

ہیں۔اب ہمیں ایک دوسرے کی مخالفت ہی میں اجتماعیت کی بقا دکھائی دے رہی ہے یا کچھ طاقتیں ایسا ہی دکھانا چاہتی ہیں۔

عوامی سطح کی سیاسی بحث میں ہم سے مراد ہے حقوق اور انصاف کی طلب کے لیے آواز بلند کرنا۔شخصی سطح پر کی جانے والی بات معاملات کو شفاف بنانے سے متعلق ہے، بالخصوص ایسے شعبوں میں جن کا دراصل قانونی تقاضوں کے ذریعے احاطہ نہیں کیا جاتا۔عشروں، بلکہ صدیوں کی بحث و تمحیص سے فرد کو جمہوریت کے حوالے سے سوچنے کی تحریک مل رہی ہے، نہ اپنی رائے کو سب کے سامنے بیان کرنے کا سلیقہ ہی عطا کیا جا رہا ہے۔ جمہوری سطح پر مذاکراتی عمل اور سودے بازی کی صفت بہت پیچیدہ ہو چکی ہے۔

اب جمہوری ماحول میں کھل کر کچھ کہنے اور اپنے مؤقف کو سب کے لیے قابلِ قبول بنانے پر بھرپور توجہ دینے کے بجائے ماہرین پر بہت زیادہ بھروسا کیا جا رہا ہے۔ بہت سے معاملات الجھے ہوئے ہیں جن کے لیے سائنٹیفک حل تجویز بھی کیا جا رہا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب ہر چیز پر سوالیہ نشان لگتا جا رہا ہے۔ دانش، علم، انحصار پذیری اور تعلقات کے حوالے سے مخالفانہ آرا موجود ہیں اور اُن کی وجہ سے معاملات مزید الجھ رہے ہیں۔ روایتی طور پر ہمارا تصور یہ رہا ہے کہ ماہرین کو دستیاب ہونا چاہیے نہ کہ ہر معاملے پر مسلط ہو رہنا چاہیے۔اب معاملہ یہی ہے۔ ماہرین سے کبھی کبھار مدد لینے کے بجائے ہم بات بات پر اُن کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں۔حکومتیں اپنے بیانیوں کو لوگوں پر مسلط کر رہی ہیں۔ بیشتر حکومتوں کا یہی حال ہے کہ کسی بھی معاملے میں اپنی ایک رائے قائم کر کے پھر اُسے منوانے کے لیے نکل پڑتی ہیں۔ ایسے میں جمہوریت کلچر کی ایک تابندہ روایت کے طور پر بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں رہی۔ علمی بنیاد پر بحث اور تجزیے کی گنجائش برائے نام رہ گئی ہے۔ حکومتیں خالص آمرانہ ہتھکنڈے اختیار کرتے ہوئے اپنی مرضی کی سوچ کو پورے معاشرے پر مسلط کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

جمہوری معاشروں میں بھی بیوروکریسی کی بلند دیواریں لوگوں کو محبوس کیے دیتی ہیں۔ عوامی مسائل پر کُھل کر بات کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑی جا رہی۔ بیوروکریسی کو خادم ہونا چاہیے مگر وہ مخدوم بننے کی طرف رواں رہتی ہے۔ وہ معاشرے کے مسائل حل کرنے کے بجائے اُن کے لیے مسئلے میں تبدیل ہو چکی ہے۔

یہ حقیقت بھی نظر انداز کر دی گئی ہے کہ حقوق کسی بھی صورتحال سے مطابقت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ کوئی مجرد تصور نہیں۔ تمام حقوق کو ایک خاص تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی طرح کے اور کسی بھی سطح کے حقوق تبدیلی سے محفوظ نہیں اور مکمل طور پر اضافت کے حامل ہیں یعنی اِنہیں ایک خاص تناظر ہی میں دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ حقوق پر کُھل کر بحث ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے۔ قوانین پتھروں کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کے لیے ہوتے ہیں۔ اُنہیں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔ سیاسی بحث و تمحیص کچھ دو اور کچھ لو کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔

جب بحث کی گنجائش نہ رہے اور اِس کے کرتا دھرتا دوسروں کو باہر نکال کر اِسے درونِ خانہ ٹائپ کی کوئی چیز بنانے پر تُل جائیں تو جمہوریت دم توڑنے لگتی ہے۔ جمہوریت کا حُسن اظہار میں ہے۔ جب کوئی خاص گروہ حکومتی امور پر متصرف ہو، سیاست پر بھرپور دسترس کا حامل ہو چکا ہو اور اپنے مخصوص مفادات کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے اظہارِ رائے کی آزادی کو ہائی جیک کر لے، بحث و تمحیص کی گنجائش ہی نہ چھوڑے تو جمہوریت کے لیے پنپنا تو دور کا معاملہ رہا، بقا کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Democracy in Decline?"
("The Globalist". February 5, 2025)

بقیہ: تجارت میں دھونس کا زمانہ گیا

بہت سے ممالک اب ڈالر کو بیچ میں لائے بغیر اپنی اپنی کرنسیوں میں کاروبار کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ امریکا کی طرف سے کیا جانے والا ہر اقدام باقی دنیا کو متبادل ذرائع کی طرف دھکیلنے کا ذریعہ بنا ہے۔ یہ بات اب امریکی پالیسی ساز بھی محسوس کر رہے ہیں۔ امریکی اقدامات کے نتیجے میں دنیا بھر میں ایسی کوششیں شروع ہوئی ہیں جن کا بنیادی مقصد عالمی مالیاتی نظام میں زیادہ سے زیادہ توازن پیدا کرنا ہے۔

ہم ۲۰۲۵ء میں جی رہے ہیں۔ اب یہ بالکل واضح ہو چکا ہے کہ کسی ایک کرنسی کی بنیاد پر کام کرنے والا عالمی مالیاتی نظام محض فرسودہ نہیں ہو چکا بلکہ خطرناک بھی ہے۔ ایک کرنسی کی بنیاد پر کام کرنے والا نظام بہت سے مواقع پر انتہائی نازک اور ہدف پذیر ثابت ہوا ہے۔ ایسے میں جب بحرانی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اُس میں محض شدت نہیں ہوتی بلکہ اُس کا دورانیہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔

ماضی میں جو کچھ ہوا، وہ سب کچھ اب بھلا دیے جانے کے قابل ہے۔ ماضی کا ہر نظام محض سبق سیکھنے کے لیے ہے، اپنانے کے لیے نہیں۔ دنیا بھر کے سیاسی قائدین کی توجہ اب اس بات پر ہونی چاہیے کہ عالمی مالیاتی نظام متوازن ہو، منصفانہ ہو اور سب کو برابری کے مواقع دینے کی گنجائش پیدا کرتا ہو۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

جیسیکا دُردُو بین الاقوامی امور کی ماہر اور چائنا فارن افیئرز یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی طالبہ ہیں۔ وہ چائنا گلوبل ٹیلی وژن نیٹ ورک کے لیے خصوصی مبصر کی حیثیت سے حالاتِ حاضرہ پر لکھتی ہیں۔

"Why threats, sanctions and one-currency dominance are past their prime". ("China Global Television Network". January 25, 2025)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی مطبوعات... ہر گھر، ہر خاندان کے لیے!

قرآن کا نظامِ خاندان	40/–	اِصلاحِ معاشرہ	600/–	معمارِ جہاں تُو ہے	1000/–
مسلمان عورت کے حُقوق	200/–	اسلام کا عائلی نِظام	250/–	خانگی زندگی اور اُسوۂ حَسَنہ	100/–
عورت اور اسلام	150/–	تحریکِ حقوقِ نسواں	300/–	خاندان کو لاحق خطرات اور مُمکنہ لائحۂ عمل	60/–
مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	100/–	بچّوں کے ذہنی اَمراض	400/–	گھریلو تشدّد اور اسلام	60/–
بچّے اور اسلام	40/–	بچّوں میں خوف	150/–	زندگی کے عام فقہی مسائل (جلد اوّل تا پنجم)	2500/–
انقلابی کتاب	250/–	آزاد بچّے، آزاد والدین	500/–	مَردوں کا جہاں اور ہے عورتوں کا جہاں اور	500/–

اکیڈمی بک سینٹر۔ ڈی ۳۵، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۳۶۸۰۲۰

کیا ٹرمپ واقعی بااختیار ہیں؟

جان سوپل

آٹھ سال پہلے واشنگٹن میں یہ ایک عام فقرہ بن گیا تھا کہ صدارت ڈونلڈ ٹرمپ کو بدل دے گی، لیکن ڈونلڈ ٹرمپ صدارت کو نہیں بدلیں گے۔

اب، اَن گنت اعلانات کے تناظر میں یہ کہنا آسان ہوگا کہ معاملہ بالکل الٹ ہو چکا ہے۔ لیکن شاید اس سے بات مکمل وضاحت نہیں ہوتی۔۔۔ کیا یہ ممکن ہے کہ حالیہ دنوں میں کیے گئے انتہائی اہم اعلانات کے پیش نظر ٹرمپ کی بجائے ان کے اردگرد موجود افراد صدارت کو بدل رہے ہیں؟ آیئے ایک بنیادی نکتے پر متفق ہو جاتے ہیں جسے ہر کوئی تسلیم کرے گا: ڈونلڈ ٹرمپ 'روایتی سیاست' سے بالکل ایک الگ شخصیت ہیں۔

اس کا ایک بصری مظہر یقینی طور پر وہ منظر تھا جب ٹرمپ اوول آفس میں 'ریزولوٹ ڈیسک' کے پیچھے بیٹھے تھے، ایلون مسک ان کے ساتھ تھے، اور ان کے سر پر ایک چھوٹا بچہ بیٹھا ان کی کالی 'میگا (ایم اے جی اے)' ٹوپی کو ان کی آنکھوں پر ڈال رہا تھا، جبکہ والد یہ وضاحت کر رہے تھے کہ انہوں نے 'لاکھوں کنڈومز حماس کے جنگجوؤں کو بھیجے جانے' کے معاملے میں غلطی کر دی تھی۔

درحقیقت وہ موزمبیق بھیجے گئے تھے تاکہ ایڈز سے نمٹا جا سکے۔ میرا خیال ہے یہ ایک عام غلطی تھی، شاید۔

ہم ایکس پر بعد میں واپس آئیں گے۔۔۔ نہیں، سوشل میڈیا پلیٹ فارم کی بات نہیں ہو رہی، بلکہ مسک کے سر پر بیٹھے بچے کی بات ہو رہی ہے۔ اس کا نام بھی ایکس ہے۔ براہ کرم توجہ دیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

لیکن یہاں ایلون مسک کچھ ایسا کر رہے تھے جو بہت کم لوگوں کو کرنے کی اجازت ہے۔ وہ ٹرمپ سے زیادہ توجہ حاصل کر رہے تھے۔ کیمرے مسک پر تھے جب وہ اپنے نام نہاد 'محکمہ برائے سرکاری استعداد کاری (ڈی او جی ای)' کی وضاحت کر رہے تھے۔ جب وہ یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ یہ سب جمہوری جواب دہی کے بارے میں ہے، مجھے انتہا درجے کی ستم ظریفی محسوس ہوئی۔

مسک، جنہیں کسی نے منتخب نہیں کیا، جنہیں کسی توثیقی سماعت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ ان کا عہدہ کوئی کابینہ کا منصب نہیں، اور جن کی تنظیم کسی بھی رسمی حکومتی ادارے کے تابع نہیں، اس طرح کانگریس کی جانچ پڑتال سے باہر ہے۔۔۔ وہ جمہوری احتساب پر لیکچر دے رہے تھے۔

مسک کا کہنا تھا کہ ان کا خوف یہ ہے کہ امریکا اب جمہوریت نہیں بلکہ ایک بیوروکریسی بن چکا ہے، جو ایک 'ڈیپ اسٹیٹ' کے زیر انتظام ہے جس کا واحد مقصد خود کو قائم رکھنا ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے مسک امریکی محکمہ خزانہ یا پینٹاگون میں جا کر دیکھ سکتے ہیں کہ کن کمپنیوں کو سرکاری ٹھیکے دیے گئے ہیں۔ لیکن خود ان کی کمپنی 'اسپیس ایکس' کے پاس امریکی حکومت کے اربوں ڈالر کے معاہدے ہیں۔ ان کے حریفوں کے پاس بھی ایسے ہی معاہدے ہیں۔ تو کیا وہ واقعی یہ فیصلہ کرنے کے لیے موزوں شخص ہیں کہ سرکاری اخراجات کہاں منصفانہ ہیں اور کہاں نہیں؟

گزشتہ ہفتے کے اختتام پر وائٹ ہاؤس کی پریس سیکرٹری سے پوچھا گیا کہ مسک کے ذاتی کاروباری مفادات اور ڈی او جی ای میں ان کے کردار کے درمیان ممکنہ مفادات کے تصادم کی نگرانی کون کرے گا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جواب کیا تھا؟ بالکل، مسک خود ہی اس کی نگرانی کریں گے۔ کیا ٹرمپ کو اندازہ ہے کہ وہ کیا چیز جنم دے چکے ہیں؟

یا پھر گزشتہ ہفتے کا ایک اور اہم اعلان دیکھ لیجیے۔۔۔ میں کاغذی اسٹرا کے بجائے پلاسٹک کے اسٹرا کی واپسی کی بات نہیں کر رہا۔ میں غزہ کے مستقبل کے بارے میں اس 'معمولی' خارجہ پالیسی مداخلت کی بات کر رہا ہوں، جس کے تحت اسے 'مشرق وسطیٰ کا ریویرا' بنانے کی تجویز دی گئی۔

یہ دیکھنے کے لیے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں تھی کہ بن یامین نتن یاہو کی حیرت انگیز کھلی ہوئی آنکھیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ کتنے حیران تھے، جب ٹرمپ نے غزہ کے بارے میں اپنا منصوبہ پیش کیا۔ کیا انتظامیہ میں کسی کو علم تھا کہ یہ ہونے والا ہے؟ ایسا نہیں لگتا۔ اور پھر بھی، ٹرمپ نے ایک ایسا خیال پیش کیا جو مکمل طور پر ان کے داماد جیرڈ کشنر کا تھا۔ کشنر نے کچھ ماہ قبل اس کا ذکر کیا تھا۔

ٹرمپ کی طرح ان کا پس منظر بھی رئیل اسٹیٹ میں ہے، یہ تمام ترقیاتی منصوبوں میں سب سے بڑا منصوبہ ہو سکتا ہے۔۔۔ غزہ کو مسمار کر دینا، ۱۸ لاکھ فلسطینیوں کو کہیں اور بھیج دینا، اور اس قیمتی زمین کو دوبارہ ترقی دینا۔ 'ریویرا سے سمندر تک؟' اگر سیدھی بات کی جائے تو شاید یہ منصوبہ پوری طرح سوچا سمجھا نہیں تھا یا ان اہم فریقین کی حمایت حاصل نہیں تھی جن کی شرکت اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری تھی۔

اور پھر یوکرین کی بات آتی ہے، جہاں 'عظیم مذاکرات کار' نے بظاہر روس کو وہ سب کچھ دے دیا جو وہ چاہتا تھا، بغیر اس کے کہ مذاکرات کا آغاز بھی ہوا ہو۔ یوکرین کو زمین چھوڑنی پڑے گی اور نیٹو میں شمولیت کی اجازت نہیں ہوگی۔ ولادی میر (پوتن) کو شاید اس سے بہتر ویلنٹائن کا تحفہ کبھی نہیں ملا ہوگا۔

ان تینوں مثالوں میں ٹرمپ ایک پُرعزم پیامبر بنے نظر آتے ہیں۔۔۔ لیکن یہ واضح نہیں کہ وہ اپنا ہی پیغام دے رہے ہیں۔ مسک، کشنر، اور پوٹن سب یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے ٹرمپ کو بخوبی قابو کر لیا ہے۔ ۲۰۱۸ء میں، میں نے ہیلسنکی میں ٹرمپ اور پوٹن کی مشترکہ پریس کانفرنس میں شرکت کی۔ پوتن نے ٹرمپ کے بیٹے بیرن کے لیے ایک فٹ بال دیا؛ اور ٹرمپ نے پوتن کو سب کچھ دے دیا (دوبارہ)۔

انہوں نے صحافیوں کو بتایا کہ انہوں نے روسی صدر کا یہ دعویٰ قبول کر لیا کہ انہوں نے ۲۰۱۶ء کے امریکی انتخابات میں مداخلت نہیں کی۔ یہ دعویٰ ہر امریکی انٹیلی جنس ایجنسی کی متفقہ رائے کے بالکل برعکس تھا۔

یہ قول مختلف اوقات میں ڈیوڈ لائیڈ جارج اور پہلی جنگ عظیم کے جنرل فیلڈ مارشل ڈگلس ہیگ سے منسوب کیا جاتا رہا ہے، اور وہ یہ ہے: 'وہ آخری شخص کے اثرات قبول کر لیتا ہے جو اس پر اثر انداز ہوتا ہے'۔

یہ تصور مکمل طور پر اس مضبوطی اور عزم کے برعکس ہے جس کا تاثر ٹرمپ دینا چاہتے ہیں۔ وہ خود کو ایک سخت گیر شخصیت کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ بالکل پوٹن، ایردوان، شی، اور بان کی طرح۔۔۔ لیکن کیا وہ درحقیقت زیادہ تابع فرمان ہیں۔۔۔ اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو پالیسی پر اثر انداز ہونے کی حد سے زیادہ اجازت دے رہے ہیں۔

یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ دوسرے لوگ انہیں احمق بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ جو ہمیں واپس ایکس کی طرف لے آتا ہے، جو اپنے انمول اوول آفس کیمیو میں نظر آیا۔ اب وہ اپنے والد کے کندھے سے اتر چکا تھا، اور 'ریزولوٹ ڈیسک' کے قریب بے چینی سے ہل جل رہا تھا جبکہ ٹرمپ کا چہرہ اور زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔

مسک کی گفتگو کے دوران چھوٹا ایکس ٹرمپ کی طرف دیکھ کر بظاہر کہہ رہا تھا: 'آپ صدر نہیں ہو۔ آپ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔' بس یہی سوچا جا سکتا ہے کہ اس نے یہ کہاں سے سیکھا۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۱۶ فروری ۲۰۲۵ء)

مالدیپ توازن کی جانب گامزن؟

Ibrahim Maahil Mohamed

جنوری ۲۰۲۵ء میں مالدیپ کے وزیرِ خارجہ اور وزیرِ دفاع نے نئی دہلی کا ہائی پروفائل دورہ کیا۔ مالدیپ میں اِس وقت جو حکومت ہے، وہ بھارت مخالف جذبات کی لہر پر سوار ہوکر آئی تھی مگر اب اُس نے اپنی طرزِ فکر و عمل تبدیل کر لی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بھارت سے تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے غیر معمولی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ یہ کچھ زیادہ پرانی بات نہیں کہ صدر محمد معزو بھارت کے خلاف بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے تھے اور بھارت مخالف بیانیہ اپنانے کی بنیاد پر انہوں نے ووٹ بھی لیے مگر جب زمینی حقیقتوں کے آئینے میں معاملات کو دیکھا تو وہ اپنی سوچ بدلنے پر مجبور ہوئے۔ اب وہ بھارت سے معاشی اشتراکِ عمل کے ذریعے تعلقات بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ اسٹریٹجک معاملات میں بھی وہ بھارت کے خلاف جانے سے گریز کی راہ پر گامزن ہیں۔

حالیہ برسوں میں مالدیپ کو بھارت کے حوالے سے پالیسی بدلنے پر کئی بار مجبور ہونا پڑا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اُسے بھارت اور چین سے تعلقات میں توازن پیدا کرنا ہے۔ یہ بیلینسنگ ایکٹ اُس کے لیے ناگزیر ہے۔ مالدیپ کا منفرد محلِ وقوع اُسے اسٹریٹجک اعتبار سے غیر معمولی حد تک ہدف پذیر بناتا ہے۔ اگر مالدیپ چاہتا ہے کہ اپنی خود مختاری اور غیر جانبداری برقرار رکھے تو اُسے بیجنگ اور دہلی سے اپنے تعلقات بہتر رکھنے چاہئیں اور دونوں ہی ممالک کو مطلوب اسٹریٹجک کردار کے حوالے سے کھل کر بتانا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ مالدیپ کو جنوب مشرقی ایشیا اور دیگر ملحق خطوں کے ممالک سے بھی تعلقات بہتر بنانے پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ اس کے نتیجے میں اس کی معیشت میں تنوع پیدا ہوگا اور وہ بہت حد تک خود کفالت کی راہ پر رواں ہوگا۔

مالدیپ کے وزیرِ خارجہ عبداللہ خلیل نے جنوری میں بھارت کا دورہ کیا اور دوطرفہ تعلقات بہتر بنانے پر بات چیت کی۔ معزو انتظامیہ نے ۲۰۲۳ء کے دوسرے نصف اور ۲۰۲۴ء کے پہلے نصف کے دوران غیر معمولی بھارت مخالف رویہ اپنایا تھا۔ اس کے نتیجے میں دونوں ممالک کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے اور معاملات اس حد تک بگڑے تھے کہ بھارت نے مالدیپ کی معیشت کے لیے مشکلات پیدا کی تھیں اور مالدیپ کی حکومت کو فوری طور پر چین کی طرف جھکنا پڑا تھا۔

معزو انتظامیہ کے ابتدائی دنوں میں مالدیپ کی مرکزی کابینہ کے چند ارکان کی طرف سے بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کے بارے میں اہانت آمیز ریمارکس دیے جانے پر نئی دہلی نے شدید ردِ عمل ظاہر کیا تھا۔ جب نئی دہلی نے احتجاج کیا تو مالدیپ کے وزرا نے لچک دکھانے اور معذرت چاہنے کے بجائے معاملات کو مزید بگاڑا۔ نئی دہلی نے اپنی سیاحوں کو مالدیپ جانے سے روک دیا۔ اس سے مالدیپ کی معیشت کو دھچکا لگا اور یوں مالدیپ کو معاشی بحالی کے لیے فوری طور پر چین سے رابطہ کرنا پڑا۔

مالدیپ کا چین کی طرف جھکنا کارگر ثابت نہ ہوا۔ مالدیپ کے معاشی بحران کو ختم کرنے میں چین قابلِ ذکر اور کارگر کردار ادا کرنے سے قاصر رہا۔ مالدیپ کو مالیاتی بحران کا بھی سامنا تھا مگر چینی قیادت تذبذب میں مبتلا رہی۔ اس کے نتیجے میں مالدیپ کے لیے اپنی مشکلات پر قابو پانا انتہائی دشوار ہوگیا اور پھر وہ مجبور ہوا کہ دوبارہ نئی دہلی کی طرف دیکھے، اُس سے اپنے تعلقات بہتر بنائے۔ بھارت نے مثبت رویے کا مظاہرہ کیا۔ مالدیپ کے قرضے ادا کرنے میں بھارت نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے نتیجے میں دوطرفہ تعلقات بہتر ہوئے۔

جب مالدیپ نے بھارت کی طرف جھکاؤ ظاہر کیا تو بھارتی قیادت بھی اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوئی اور اگست ۲۰۲۴ء میں بھارتی وزیرِ خارجہ ایس جے شنکر نے مالدیپ کا دورہ کیا۔ اس دورے نے دوریاں گھٹانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس موقع پر مالدیپ کے صدر محمد معزو نے بھارت کو اپنے قریب اتحادیوں میں شمار کیا۔ انہوں نے اُن افسران اور وزرا سے استعفے بھی لیے جنہوں نے بھارتی وزیرِ اعظم نریندر مودی کے لیے اہانت آمیز باتیں کہی تھیں۔ سوشل میڈیا سے متعلقہ پوسٹیں ڈیلیٹ بھی کروادی گئیں۔ بھارت سے کیے گئے دفاعی معاہدوں پر نظر ثانی کے حوالے سے مالدیپ کی پارلیمنٹ میں اپوزیشن کی طرف سے پیش کی جانے والی درخواستیں سرد خانے میں ڈال دی گئیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مالدیپ کی حکومت اب بھارت کو ناراض کرنے کے موڈ میں نہیں۔

عبداللہ خلیل نے معاشی بحالی، تجارت اور علاقائی سلامتی کے حوالے سے بات چیت کی۔ بھارت نے مالدیپ سے مالیاتی تعاون جاری رکھا۔ ۲۰۲۴ء میں اُس نے مالدیپ کو ۴۰ کروڑ ڈالر دیے تھے۔ اس رقم کی مدد سے مالدیپ کی حکومت نے مالیاتی مشکلات دور کیں۔ بھارتی قیادت نے بھی ثابت کیا کہ وہ بحرِ ہند کے خطے میں مالدیپ جیسے ملک کو خواہ مخواہ ناراض نہیں کرنا چاہتی۔ دونوں ممالک کے درمیان لوکل کرنسی سیٹلمنٹ معاہدے کے حوالے سے بھی بات ہوئی ہے تاکہ بیرونی کرنسیوں پر انحصار کم کیا جاسکے۔ عبداللہ خلیل نے کہا کہ اس بات چیت کے نتیجے میں دوطرفہ تجارت کے حوالے سے پائی جانے والی تمام الجھنیں دور ہوں گی اور دونوں ممالک بڑے پیمانے پر تجارت کرسکیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ عبداللہ خلیل نے بحرِ ہند کے خطے میں امن و سلامتی کے حوالے سے بھارت کے کردار کو بھی تسلیم کیا اور سراہا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا ملک بحرِ ہند کے خطے میں امن و استحکام کے لیے بھارت اور دیگر علاقائی قوتوں کے ساتھ مل کر کام کرتا رہے گا۔

کچھ ہی دن بعد مالدیپ کے وزیرِ دفاع محمد غسان مامون نے بھی نئی دہلی کا دورہ کیا۔ محمد معزو کے صدر منتخب ہونے کے بعد یہ مالدیپ کے وزیرِ دفاع کا بھارت کا پہلا دورہ تھا۔ محمد غسان مامون نے بھارتی ہم منصب راج ناتھ سنگھ سے بات چیت کی جس میں مالدیپ کی فوج کی استعداد بڑھانے سے متعلق اقدامات پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ اس حوالے سے مشترکہ مشقیں تجویز کی گئیں۔ دونوں وزرائے دفاع نے دفاعی اشتراکِ عمل پر مشاورت کی۔ یاد رہے کہ مالدیپ کے صدر محمد معزو نے اپنی سرزمین پر تعینات بھارتی فوجیوں کو نکال دیا تھا مگر پھر انہوں نے اپنی پالیسی تبدیل کی اور بھارت کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اب دونوں ممالک علاقائی سلامتی کے حوالے سے ایک وسیع تر اور جامع میکینزم تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کچھ اکتوبر ۲۰۲۴ء میں محمد معزو اور نریندر مودی کے درمیان طے پانے والی وژن فار کمپری ہینسو اکنامک اینڈ میری ٹائم پارٹنرشپ کے مطابق ہے۔ مالدیپ نے ۲۰۲۴ء میں چین کے ساتھ بھی ایک دفاعی معاہدہ کیا تھا۔ مالدیپ کے وزیرِ دفاع محمد غسان مامون کے نئی دہلی کے حالیہ دورے کو چین اور بھارت کے درمیان بیلینسنگ ایکٹ کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔

بھارت روایتی طور پر مالدیپ کا نمایاں ترین حلیف رہا ہے تاہم حالیہ چند برسوں کے دوران مالدیپ بظاہر بھارت اور چین کے درمیان تھوڑا سا الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے پر سبقت لیے جانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔ یہ سب کچھ ۲۰۱۴ء میں شروع ہوا،

جب مالدیپ نے چین کے بیلٹ اینڈ روڈ پراجیکٹ کا حصہ بننا قبول کیا۔ بھارت نے چین کی موجودگی میں اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے مالدیپ کے معاملے میں چھڑی اور گاجر والی حکمتِ عملی اختیار کی۔ تب مالدیپ کے صدر عبداللہ یامین تھے۔ اس کے بعد دونوں پڑوسیوں کے درمیان کشیدگی کی ابتدا ہوئی۔ بھارت نے مالدیپ میں چین کے بڑھتے ہوئے اثرات پر سوال بار ہا اٹھایا ہے۔ مالے کی بندرگاہ پر چینی جہازوں کے لنگرانداز ہونے پر بھی بھارت کو اعتراض ہے کیونکہ اس بندرگاہ کے نزدیک ہی بھارت کی بھی نوتعمیر شدہ بندرگاہ ہے۔

اس کے بعد مالدیپ میں بننے والی حکومتوں نے بھارت کو بہت حد تک نظرانداز کر کے چین کی طرف جھکنے کو ترجیح دی۔ یہ سب کچھ اس لیے بھی ناگزیر تھا کہ مالدیپ کی معاشی پریشانیاں بہت زیادہ تھیں اور وہ چین کی طرف سے دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھائے جانے کی توقع کر رہا تھا۔ مالدیپ کو اپنے مخصوص محلِ وقوع کے باعث بھی خطرات کا سامنا تھا۔ ایسے میں لازم تھا کہ وہ چین جیسے بڑے ملک کو قریبی حلیف بنائے۔ بیرونی امداد پر بہت زیادہ انحصار کرنے کے باعث مالدیپ کو دو بڑی طاقتوں کے درمیان تعلقات اور اشتراکِ عمل کے حوالے سے توازن برقرار رکھنے میں غیر معمولی الجھنوں کا سامنا رہا ہے۔ اُسے اپنی خودمختاری اور استحکام کا تحفظ بھی یقینی بنانا ہے۔

بیرونی امداد پر انحصار مالدیپ کی بنیادی مجبوری ہے۔ یہ ملک چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ہے۔ ماحول کے ہاتھوں بھی مالدیپ کے وجود کو خطرات لاحق ہیں۔ معیشت کمزور ہے۔ صرف سیاحت سے ہونے والی آمدنی پر گزارا ہے۔ سی فوڈ کی برآمد سے بہت کچھ حاصل ہوسکتا ہے مگر اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ ملک خود کفالت کی راہ پر زیادہ دور تک گامزن نہیں رہ پاتا۔ جی ڈی پی میں سیاحت کا حصہ ۷۰ فیصد سے زائد ہے۔ بڑے پیمانے پر زراعت ممکن ہے نہ مینوفیکچرنگ۔ روزمرہ استعمال کی اشیا کے لیے درآمدات پر انحصار بہت زیادہ ہے۔ کووڈ کے بعد روس اور یوکرین کی جنگ بھی مالدیپ کی معیشت پر بہت حد تک اثرانداز ہوئی ہے۔

چین نے مالدیپ میں کئی پُل اور ایک بڑا ایئرپورٹ تعمیر کیا ہے۔ یہ سب کچھ بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹو کی بدولت ممکن ہوسکا۔ مالدیپ کی بیشتر درآمدات چین سے ہیں۔ تجزیہ کار کہتے ہیں کہ چین سے تجارت میں مالدیپ کو صرف خسارے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وقت مالدیپ پر ۴۲ فیصد بیرونی قرضے چین کے ہیں۔ چین پر اُس کا غیر معمولی انحصار خرابیاں پیدا کرتا رہا ہے۔ آزاد تجارت کے معاہدے کے تحت چین اپنا مال بہت بڑے پیمانے پر مالدیپ میں ڈمپ کرتا رہا ہے۔ ایسے میں مالدیپ کی اپنی صنعتیں برائے نام رہ گئی ہیں۔

روایتی طور پر بھارت ہی مالدیپ کا حلیف رہا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان قربت نے اِن میں اشتراکِ عمل کے لیے ہمیشہ گنجائش پیدا کی ہے۔ دونوں ممالک سلامتی سے متعلق امور میں بھی ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہے ہیں۔ بھارت نے مالیاتی بحرانوں سے نپٹنے میں مالدیپ کی بھرپور معاونت کی ہے۔ بھارت نے مالدیپ میں بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کے حوالے سے وہ تیزی نہیں دکھائی جو چین نے دکھائی ہے۔ چین نے مالدیپ کے بنیادی ڈھانچے میں بہت زیادہ سرمایہ کاری کی ہے۔ اس کے نتیجے میں کبھی کبھی مالدیپ کا چین کی طرف جھکنا بنتا بھی ہے۔ بھارت پر مالدیپ کے معاملات میں کچھ زیادہ مداخلت کا الزام بھی عائد کیا جاتا رہا ہے۔ چین نے ایسا کرنے سے اب تک مکمل گریز کیا ہے۔

مالدیپ کے لیے بہتر نہیں کہ بار بار پالیسیاں بدلتا رہے۔ اُسے ایسی متوازن پالیسیاں اختیار کرنی چاہئیں جو چین اور بھارت سے اُس کے تعلقات کو کسی بھی صورت داؤ پر نہ لگائیں۔ بار بار پالیسیاں بدلنے سے مالدیپ دونوں ہی علاقائی طاقتوں کی نظر میں بے اعتبار ٹھہر سکتا ہے۔ مالدیپ کو خارجہ پالیسی کی بنیاد شفاف رکھنی چاہیے تاکہ کسی کو کسی بھی طرح کا غلط پیغام نہ جائے۔ اپنے اسٹریٹجک مقاصد میں شفافیت کا اہتمام کر کے مالدیپ دونوں ہی بڑی طاقتوں سے اپنے تعلقات متوازن رکھ سکتا ہے۔

مالدیپ کو نئی دہلی اور بیجنگ سے اپنی بات کسی بھی نوع کے ابہام کے بغیر کہنی چاہیے۔ اُسے یہ واضح پیغام دینا چاہیے کہ وہ اِن طاقتوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کرنے کے بجائے اِن سے معقولیت پر مبنی تعلقات استوار رکھنے کا خواہشمند ہے تاکہ خطے کا امن و استحکام برقرار رہے۔ ایک طرف تو چین سے بنیادی ڈھانچے میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری اور تکنیکی تعاون کی خواہش ظاہر ہونی چاہیے اور دوسری طرف بھارت پر بھی واضح کر دینا چاہیے کہ معاشی اور علاقائی سلامتی یقینی بنائے رکھنے میں اس کا بھی غیر معمولی کردار ہے جو کسی صورت نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مالدیپ کو چین اور بھارت پر یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ اس کی تمام پالیسیاں خودمختاری یقینی بنانے کے لیے ہیں نہ کہ بیرونی دباؤ کے آگے جھکنے کا نتیجہ۔

مالدیپ کو خطے کے دیگر ممالک سے تعلقات استوار کرنے پر بھی توجہ دینی چاہیے تاکہ اس کے لیے سیاسی، سفارتی اور معاشی تنوع کا اہتمام ہو۔ چین یا بھارت پر بہت زیادہ انحصار کرنے کے بجائے مالدیپ کو بہت سے ممالک سے متوازن تعلقات استوار کرنے چاہئیں۔ آسیان کے رکن ممالک سے تعلقات بہتر بنا کر مالدیپ اپنے لیے معاشی اور اسٹریٹجک استحکام کی بنیاد وسیع کرسکتا ہے۔ جاپان نے بھی مالدیپ میں بہت سے منصوبے مکمل کیے ہیں۔ متوازن پالیسیوں کے ذریعے مالدیپ کئی ممالک سے اپنے لیے مثبت اور تعمیر کردار ادا کرواسکتا ہے۔ بین الاقوامی امدادی اداروں سے بھی مالدیپ غیر معمولی فنڈنگ کرواسکتا ہے۔ اُس کے وجود کو پانی کی بلند ہوتی ہوئی سطح سے خطرات لاحق ہیں۔ اس حوالے سے غیر معمولی فنڈنگ چاہیے۔ متوازن پالیسیوں کے ذریعے اقوامِ متحدہ اور یو ایس ایڈ جیسے بڑے امدادی اداروں سے بھی فنڈنگ حاصل کی جاسکتی ہے۔

بیرونی تعلقات کا دائرہ وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ مالدیپ کی حکومت کو حکمرانی کا معیار بلند کرنے اور اندرونِ ملک زیادہ سے زیادہ استحکام اور توازن پیدا کرنے پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ کرپشن پر قابو پانا لازم ہے۔ سرکاری منصوبوں کی بروقت تکمیل ایک بڑا مسئلہ ہے۔ معاشی تنوع بیرونی انحصار کو کم کرنے کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔ معاشی خود کفالت مالدیپ کے لوگوں کو باہر کی طرف دیکھنے کی زحمت سے بہت حد تک بچاسکتی ہے۔ اپنے وسائل پر انحصار کے ذریعے جینے کی عادت معاشی اور سماجی، دونوں ہی طرح کے معاملات درست کرنے اور درست رکھنے میں کلیدی کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اس حوالے سے پالیسیوں میں توازن لازم ہے اور زیادہ سے زیادہ خود کفالت یقینی بنانے پر خاص توجہ دینا ہوگی۔ بیرونی امداد پر انحصار گھٹانا ہوگا تاکہ کوئی بھی ملک پالیسیوں پر اثرانداز نہ ہوسکے۔

اگر مالدیپ کو آگے بڑھنا ہے تو سفارت کاری اور اسٹریٹجی کے حوالے سے دوراندیشی لازم ہے۔ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہوگا۔ چین اور بھارت میں سے کسی کی بھی طرف بہت زیادہ جھکاؤ درست نہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ مالدیپ اپنے لیے معیاری اور متوازن راستہ چُنے اور اُسی پر چلتا رہے۔ چین اور بھارت کے درمیان جو مسابقت جاری ہے، اُس کا شکار ہونے کے بجائے مالدیپ کو اپنی غیر جانبدار حیثیت برقرار رکھنے پر توجہ دینی چاہیے۔ آنے والے سال اس حوالے سے مالدیپ کے لیے آزمائش ثابت ہوسکتے ہیں۔ اِس کے لیے اُسے ابھی سے غیر معمولی تیاری کرنی ہوگی۔

(مترجم: ابوصباحت)

"How the Maldives can navigate successfully between India and China?".
("southasianvoices.org". February 4, 2025)

بچّے ہوم ورک سے نہیں سیکھتے!

زبیدہ مصطفیٰ

حال ہی میں والدین نے مشاہدہ کیا کہ ان کا سات سالہ بچہ ہوم ورک کیسے کرتا ہے تو انہوں نے چند دلچسپ باتیں نوٹ کیں۔ بچے کو وہ کام کرنے میں مزہ آتا تھا جو اس کی دلچسپی کا باعث بنتے لیکن وہ ہوم ورک کرنے کے لیے اسے حوصلہ افزائی کی ضرورت پڑتی جو اسے پسند نہیں تھے۔ والدین نے سوچنا شروع کیا کہ کیا واقعی تمام طلبہ کے لیے ایک قسم کا ہوم ورک موزوں ہوسکتا ہے۔

کسی بھی استاد کے لیے اپنے تمام طلبہ کی مختلف تعلیمی ضروریات اور دلچسپیوں کو پورا کرپانا ناممکن ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر طالب علم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں ایک اسمبلی لائن سسٹم ہے جس کے تحت ہر بچے کی منفرد خوبیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، تمام کو ایک ہی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ بہت سے والدین جو اپنے بچوں پر خصوصی توجہ دیتے ہیں، اب وہ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

پہلا سوال یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ ایک بچے کو اپنے دن کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ مطالعہ، کتابیں پڑھنے اور اپنی مشق کی کتابوں میں کیوں صرف کرنا پڑتا ہے۔ یہاں میں پرائمری اسکول کے ان چھوٹے بچوں کی بات کررہی ہوں جن کی عمریں عام طور پر دس سال سے کم ہوتی ہیں۔ میں نے اس پر غور کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک پرائمری اسکول ٹیچر سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنے طلبہ کو ہوم ورک دیتی ہیں؟

میرے سوال نے ٹیچر کو حیران کیا۔ انہوں نے وضاحت کی کہ انہیں کچھ نیا سکھانے کے بعد ہوم ورک دینا پڑتا ہے تاکہ یہ یقینی بنایا جاسکے کہ طالب علم اسے اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ یوں ہوم ورک دینے سے کلاس میں جو کچھ سیکھا اس کا جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے۔

اب حیران ہونے کی باری میری تھی کیونکہ وہ واضح طور پر بچوں کے سیکھنے کے عمل سے متعلق نہیں سمجھتیں۔ ان کی سوچ یہ ہے کہ جیسے ٹیچر بچے کے دماغ میں معلومات اس طرح منتقل کررہا ہے جیسے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا جاتا ہے۔ لیکن بچے اس طرح نہیں سیکھتے۔ وہ اپنے تجربات اور تجسس کے ذریعے سیکھتے ہیں۔

کم عمر بچوں کے یہ تجربات ہیں جو علم حاصل کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ ان کا فطری تجسس ان کی ذہنی صلاحیتوں کو بنانے میں مدد کرتا ہے۔ علم ایسی چیز نہیں ہے جسے صرف زبانی طور پر سکھایا جاسکتا ہو بلکہ ایک بار بچہ کچھ سیکھ لیتا ہے تو وہ اسے نہیں بھولتا۔ انہیں یاد رکھنے کے لیے ہوم ورک کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہر بچہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور ان کی نشوونما منفرد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ بچے جن چیزوں میں دلچسپی لیتے ہیں، کچھ بچوں کو وہی چیزیں بور کرنے والی لگ رہی ہوتی ہیں۔

یہ بنیادی حقائق ہیں کہ بچے قدرتی طور پر کیسے سیکھتے ہیں اور ہمیں انہیں کبھی بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم فطرت کے خلاف جاتے ہیں اور ان اصولوں پر زور دیتے ہیں جو بے معنی ہیں تو بچہ مزاحمت کرے گا اور اس کی تعلیم میں حقیقی دلچسپی پیدا نہیں ہوگی۔ اگر ایک استاد کا خیال ہے کہ بچے کو یہ یاد رکھنے کے لیے ہوم ورک کرنے کی ضرورت ہے کہ اسے کلاس میں کیا پڑھایا گیا ہے تو ہمیں استاد کے طریقِ تدریس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ بات دنیا بھر میں مانی جاتی ہے کہ چھوٹے بچے کھیل کے ذریعے زیادہ بہتر انداز میں سیکھتے ہیں لیکن ہمارے یہاں کتنے اسکول ایسے ہیں جن میں کھیل کے میدان موجود ہیں یا وہاں ایسے طریقے اپنائے جاتے ہیں جو بچوں کو جلدی اور مؤثر انداز میں سیکھنے میں مدد کرتے ہیں؟ افسوسناک ہے کہ جسمانی مشق پر توجہ نہیں دی جاتی ہے حالانکہ یہ بچے کے دماغی نشوونما کے لیے بہت ضروری ہے۔

سسٹر زینیا پنٹو کی قیادت میں کراچی میں سینٹ جوزف کانوینٹ کے پرائمری سیکشن میں نہ تو ہوم ورک دیا جاتا ہے اور نہ ہی امتحانات ہوتے ہیں۔ یہاں بچے خوش ہیں اور اچھی طرح سے ایڈجسٹ کرتے ہیں۔ وہ استاد کی خواہش کے مطابق ان چیزوں کا مطالعہ کرنے پر مجبور نہیں ہوتے۔ یوں انہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ سسٹر زینیا نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ بچوں کو انتخاب کا حق حاصل ہو جس کی وجہ سے وہ تعلیم میں لطف محسوس کرتے ہیں۔

ان ماہرین تعلیم اور والدین کو بتاتے چلیں جو مغربی تعلیمی نظام کو بچوں کے لیے مثالی سمجھتے ہیں۔ میرے پوتے پوتیاں جب پرائمری اسکول میں تھے تو میں نے ان سے ان کے ہوم ورک کے متعلق پوچھا۔ کینیڈا میں مقیم میری پوتی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر مجھے بتایا کہ اسے ہفتے میں ایک ہوم ورک اسائنمنٹ ملا ہے جسے ختم کرنے کے لیے ایک ہفتے کا وقت دیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اسے مکمل کرنے میں اسے کتنا وقت لگے گا؟ تو میری پوتی نے جواب دیا، دس یا پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں۔

برطانیہ میں میری پوتی نے بتایا کہ پیر کو ہوم ورک کا دن تھا اور انہیں نئے سوالات دیئے گئے جنہیں مکمل کرنے کے لیے ایک ہفتے کا وقت دیا گیا ہے۔ بچوں نے اگلے پیر کو جوابات جمع کروائے اور کسی نے کام کے بوجھ کی شکایت نہیں کی۔

تو کیا ہمارے بچے اتنے ہوشیار نہیں ہیں کہ وہ روزانہ بنا کسی مشکل کے اپنا ہوم ورک کرسکیں؟ کیا ہمارے اساتذہ میں کوئی خرابی ہے؟ یا مسئلہ خود ہمارا تعلیمی نظام ہے؟

ایک اور چیز جو بچے کی فطری تعلیم کی راہ میں حائل ہوتی ہے وہ اسے سکھانے کے لیے استعمال کی جانے والی زبان ہے۔ اگر ایسی زبان جس سے بچہ واقف نہیں ہے ان پر زبردستی مسلط کی جائے تو یہ ان کی ذہنی نشوونما کو متاثر کرسکتی ہے۔ اس صورت میں خود سے سیکھنے کا عمل مشکل بن جاتا ہے اور بچہ روٹ لرننگ یا رٹے پر انحصار کرنے لگتا ہے جسے مسلسل دہرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہوم ورک ضروری ہوجاتا ہے۔

"Why homework?".
(Daily "Dawn" Karachi. February 6, 2025)

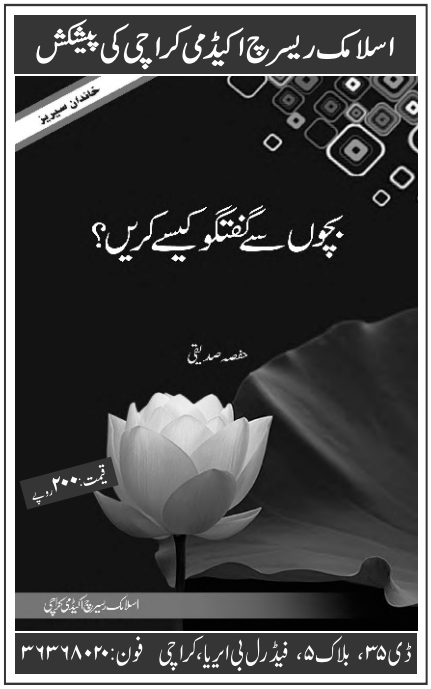

ڈیپ سیک نے اُونچی دیواروں میں دَراڑ ڈال دی

ایک نئی دوڑ شروع ہوچکی ہے۔ یہ دوڑ مصنوعی ذہانت کی ہے۔ ہر ملک چاہتا ہے کہ مصنوعی ذہانت کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لاکر انسانوں پر انحصار کم کرے۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ انسانوں کو ملازمت دینے سے بہت سے جھمیلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مصنوعی ذہانت یعنی مشینی ذہانت تنخواہ بھی نہیں مانگتی اور مراعات کے مطالبے سے بھی گریزاں رہتی ہے۔ یہ چھٹی بھی نہیں کرتی اور بیماری یا کسی اور بہانے کے ذریعے کام چوری بھی نہیں کرتی۔ ایسے میں آجر بھلا کیوں نہ اس کے گرویدہ ہوں۔

امریکا اور یورپ نے مصنوعی ذہانت پر انحصار بڑھا دیا ہے کیونکہ اِس صورت میں اخراجات کا گراف بھی نیچے آتا ہے اور کارکردگی کا معیار بلند ہوتا ہے۔ مصنوعی ذہانت کو اہم ترین ٹُول کے طور پر بروئے کار لانے سے خودکاریت میں زیادہ سے زیادہ مدد ملتی ہے اور شہری نظم و نسق بہتر بنانے میں بھی مدد ملتی ہے۔ بہت سے بنیادی کام اب مصنوعی ذہانت کے حوالے کردیے گئے ہیں۔

ٹیکنالوجی کے شعبے میں اس وقت مغرب کو منہ دینے کی طاقت کسی میں ہے تو وہ چین ہے۔ چینی قیادت کسی بھی شعبے میں پیچھے نہیں رہنا چاہتی۔ اُس نے کاروباری دنیا کے ہر پہلو پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ جدید ترین ٹیکنالوجی کے شعبے میں بھی چین کو آگے بڑھانا چینی قیادت اپنی بنیادی ذمہ داری سمجھتی ہے۔

امریکا میں اوپن اے آئی کے تحت جب چیٹ جی پی ٹی نے مصنوعی ذہانت کی دنیا میں قدم رکھا تو چین کو بھی فکر لاحق ہوئی کہ اِس کے توڑ کے لیے کچھ نہ کچھ تو کیا ہی جانا چاہیے۔ اب چین ''ڈیپ سیک'' کے ساتھ اِس میدان میں اترا ہے اور آتے ہی کھلبلی سی مچادی ہے۔ اِس چینی اے آئی اسٹارٹ اپ نے عالمی سطح پر اے آئی کے لینڈ اسکیپ کو نمایاں طور پر زیرِ اثر کرلیا ہے۔ ڈیپ سیک نے چین اور امریکا، دونوں ہی کے ایپ اسٹور چارٹس کو ٹاپ کیا ہے۔ اِس نے ایک طرف تو چین کے لیے وسیع تر امکانات کی راہ ہموار کی ہے اور دوسری طرف ٹیکنالوجی کے شعبے میں امریکی برتری کو بھی چیلنج کیا ہے۔ امریکا اے آئی کے حوالے سے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی پر زیادہ دلجمعی سے کاربند رہا ہے تاکہ چین یا کسی اور ابھرتی ہوئی معیشت کو اس میدان میں زیادہ آگے بڑھنے کا موقع نہ مل سکے۔

امریکا اور یورپ کے لیے زیادہ پریشان کن بات یہ بھی ہے کہ انٹرنیشنل میڈیا آؤٹ لیٹس نے ڈیپ سیک کی غیر معمولی کامیابیوں کو نمایاں کوریج دینے میں بھی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ برطانوی اخبار 'دی فائنانشل ٹائمز' نے ڈیپ سیک کی کامیابی کو اے آئی کے شعبے میں چین کی بڑھتی ہوئی جدت پسندی سے تعبیر کیا ہے جبکہ امریکی میڈیا آؤٹ لیٹ 'بزنس انسائڈر' نے لکھا ہے کہ چین نے اے آئی کے سرکردہ امریکی اداروں سے خود کو ہم آہنگ رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اِس میں بہت حد تک کامیاب رہا ہے۔ 'فوربز' نے ڈیپ سیک کے طاقتور ریسرچ ٹُول اوپن سورس آرون ماڈل کو غیر معمولی تاثیر کا حامل قرار دیا ہے۔ ڈیپ سیک کے بارے میں مغربی میڈیا کی مثبت رپورٹس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چین کے اس اے آئی اسٹارٹ اپ کی طاقت اور جدت پسندی معقول ہے اور اِس سے بالواسطہ طور پر امریکا کی چار دیواری والے باغ کی اسٹریٹجی بہت حد تک ناکام ہے، جس کا بنیادی مقصد چین کو نئی ٹیکنالوجی سے دور رکھنا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا مصنوعی ذہانت کے شعبے میں اپنی پیدا کردہ برتری کا بھرپور فائدہ اٹھانے میں کامیاب رہا ہے۔ اُس نے الگ تھلگ رہ کر ٹیکنالوجی میں اپنی برتری برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ایک طرف تو اُس نے ٹیکنالوجی کی منتقلی پر پابندی لگائی ہے اور دوسری طرف باصلاحیت افراد کی حرکت پذیری بھی محدود کی ہے۔ اِسے ''ہائی والز اینڈ اسمال کورٹ یارڈ اسٹریٹجی'' کہا جاتا ہے۔ بہرکیف، یہ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ اوپن سورس کے اصول کی بنیاد پر ڈیپ سیک کی پیشرفت نے امریکا کی طرف سے ٹیکنالوجی کو سینت سینت کر رکھنے کی حکمتِ عملی کو ناکام ثابت کیا ہے۔

ڈیپ سیک کی غیر معمولی کامیابی سے عالمی سطح پر مصنوعی ذہانت کی دنیا میں بھرپور مسابقت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سب کچھ امریکا کے بڑے ہائی ٹیک اداروں کی بالادستی کے لیے بلاواسطہ چیلنج کا درجہ رکھتے ہیں۔ امریکا صدیوں پرانے طریقے کے مطابق خود کو الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں۔ اگر وہ اِس راہ پر زیادہ چلے گا تو گڑھے میں گرے گا۔

مصنوعی ذہانت کے شعبے میں بڑھتی ہوئی پیش رفت عالمی سطح پر اشتراکِ عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ کاروباری دنیا میں مسابقت لازم ہے مگر ایک دوسرے کے وجود کو برداشت کرتے ہوئے مسابقت کے میدان میں کچھ کر دکھانا ہوتا ہے۔ کسی ادارے یا اداروں کو تباہ کرنا مسائل کا حل نہیں ہوتا بلکہ اِس کے نتیجے میں تو مزید مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی ایک قوم اس میدان میں ضروری سمجھی جانے والی تمام تحقیق نہیں کرسکتی، تمام کارنامے تنہا انجام نہیں دے سکتی۔ لازم ہے کہ مل کر کام کیا جائے، ایک دوسرے کو قبول کیا جائے اور معاملات کو مسابقت کے ساتھ ساتھ اشتراکِ عمل کے ذریعے بھی درست کیا جائے۔ بین الریاستی بنیاد پر ڈیٹا شیئرنگ ناگزیر ہے۔ ڈیٹا بیس کی تیاری کے حوالے سے اشتراکِ عمل کی گنجائش پیدا کی جانی چاہیے۔ نمایاں کارکردگی کے لیے ایک دوسرے کے تجربے سے مستفید ہونا لازم ٹھہرا۔ امریکا اور یورپ نے بھی باقی دنیا سے بہت کچھ سیکھ کر ہی ترقی کی تھی۔ اب بھی اگر وہ سیکھنا چاہیں تو بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بہت کچھ سکھا بھی سکتے ہیں۔ دوسروں کو غلام بنا کر رکھنے کی ذہنیت ترک کرنی ہوگی۔ امریکا اب بھی اشتراکِ عمل سے کہیں زیادہ دباؤ پر یقین رکھتا ہے جو اچھی سوچ نہیں۔ عالمگیریت کا غلغلہ بھی مغرب ہی سے اٹھا تھا اور اب مغرب ہی اِس کے خلاف جارہا تھا۔ آزاد تجارت کا ڈول بھی مغربی طاقتوں ہی نے ڈالا تھا مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ دیگر خطے بھی پنپ رہے ہیں تو پیچھے ہٹ گئیں۔ دنیا بھر کے بڑے ہائی ٹیک ادارے اپنی تحقیق اور ترقی کے ذریعے دوسروں کے لیے بھی بہت کچھ کرنے کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ امریکا نے بھی اِسی طور خود کو مضبوط بنایا ہے۔ دنیا بھر کے باصلاحیت افراد کو اپنے ہاں بلا کر اُن سے کام لیا ہے اور بھرپور ترقی ممکن بنائی ہے۔ جب کوئی بڑا ملک کسی پسماندہ ملک سے باصلاحیت افراد کو اپنے ہاں بلاتا ہے تو ایک طرف خود اُس کی ترقی کی بنیاد وسیع اور مضبوط ہوتی ہے اور دوسری طرف اُس پسماندہ ملک کی پسماندگی کا گراف مزید بلند ہوتا ہے۔ جب بہت بڑے ادارے عالمگیر سطح پر کام کرتے ہیں تو ایک دوسرے کے لیے مل کر کام کرنے کی گنجائش بھی پیدا کرتے ہیں۔ یوں بھرپور جدت کی راہ ہموار ہوتی رہتی ہے۔

پرائیویسی، سکیورٹی اور اخلاقی معاملات میں بھی مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے مکالمے کی ضرورت ہے۔ اشتراکِ عمل اور تعاون بڑھانا ہے۔ اگر کھل کر بات کی جائے تو عالمی برادری مصنوعی ذہانت سے اپنی

////// باقی صفحہ نمبر ۳ \\\\\\

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950